بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام باری، مانچسٹر

روایات سے قرآن کی تفسیر

بقول محترم غلام احمد پرویز صاحب حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ، خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو، قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کی جگہ، خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دیئے جائیں، تو بھی بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآن کریم کا انداز اور اسلوب بالکل نرالا ہے۔ یہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ تو اس کے عربی زبان ہی کے ہیں، لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی ترتیب میں ردوبدل کرنے سے، وہ بات باقی رہ سکتی ہے اس لئے قرآنی آیات کا ''مفہوم'' سمجھنا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا اور حضور ﷺ نے اسے صحابہؓ کو سمجھایا۔ ظاہر ہے کہ اس آسمان کے نیچے اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ سے بہتر نہ تو کوئی قرآن کو سمجھانے والا ہو سکتا ہے اور نہ قدسیوںؓ کی اس جماعت سے بہتر سمجھنے والا۔ اس لئے ہمیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں کسی اور طرف رخ کرنے کی ضرورت ہی نہیں'' یہ بالکل بجا اور درست ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو کچھ حضور ﷺ نے سمجھایا تھا وہ اپنی اصلی شکل میں ہم تک نہیں پہنچا۔ سوائے قرآن کے کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے اگرچہ احادیث و روایات کی کتابوں میں اسے تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اس کا واضح اور بین ثبوت یہ ہے کہ قرآن کریم کی جس تفسیر کو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ حضور ﷺ کی حقیقی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً صحیح بخاری کو احادیث نبویؐ کا مستند ترین مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں قرآنی آیات کی وہ تفسیر دی گئی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ نبی اکرمؐ نے بیان فرمائی تھی۔۔۔۔ یہ تفسیر کس قسم کی ہے اس کے لئے چند آیات و روایات درج ذیل ہیں۔

ولقد اتینا موسی الکتب فلا تکن فی مریۃ من لقائہ و جعلنہ ھدی

لبنی اسرائیل (32/23)۔

ہم نے اس سے پہلے موسیٰ کو بھی اس قسم کا ضابطہ حیات دیا تھا جس کی روشنی میں بنی اسرائیل کو صحیح راستے پر چلنا تھا لیکن ان میں سے بعض نے اس سے سرکشی برتی تو انہیں اس کی سزا ملی۔ لہٰذا (اے مخاطب) تمہیں اس باب میں قطعاً کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ سزا تمہارے سامنے بھی آ کر رہے گی۔ (مفہوم القرآن)۔

دی ہم نے موسیٰ کو کتاب پس مت رہ تو بیچ شک کے ملاقات اس کی سے اور کیا ہم نے اس کو ہدایت واسطے بنی اسرائیل کے۔

(ترجمہ از شاہ رفیع الدین صاحب محدث دہلوی)۔

And undoubtedly, We bestowed Book to Musa, you therefore doubt not about meeting him and We made it a guidance for the children of Israel.(ترجمہ از پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب)۔

صحیح بخاری جلد 4 حدیث نمبر 462 میں ابنِ عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا! اس رات جب میں آسمان پر چڑھا موسیٰ کو دیکھا پھر آپؐ نے موسیٰ کا قد اور حلیہ بیان کیا اور فرمایا کہ میں نے عیسیٰ کو دیکھا اور ان کا حلیہ بیان کیا پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اللہ کی نشانیوں میں سے دوزخ کے گیٹ کیپر مالک اور دجال کو دیکھا اور حضورؐ نے مندرجہ بالا آیت اس طرح تلاوت فرمائی (ترجمہ): So be not you in doubt of meeting him when you met Moses during the night of Miraj over the heavens (32/23) اس کے برعکس قرآن میں سورۃ السجدہ کی آیت کریمہ 23 دیکھئے اس میں نہ رات کے لئے لیل کا لفظ ہے نہ معراج اور سمٰوات کے الفاظ۔ بخاری کی حدیث میں آیت کا جزو ''ولقد اتینا موسی الکتب'' حذف کیا گیا ہے۔ (معاذ اللہ)۔ اس تفسیر کو رسول اللہ ﷺ کے نام سے منسوب کر کے ظاہر ہے کہ روایت کے ذریعے قرآن کریم میں تحریف کرنے کی سازش کی گئی ہے انگریزی و اردو تراجم روایت کے اثبات کی خاطر اس کے مطابق دیے گئے ہیں۔

سورہ ھود میں ہے الا انھم یثنون صدورھم لیستخفوا منہ الا حین یستغشون ثیابھم یعلم ما یسرون وما یعلنون انہ علیم بذات الصدور o ان کی یہ کوشش کہ یہ دہری شخصیت کی زندگی بسر کریں سینے کے اندر چھپا کر کچھ اور رکھیں اور باہر کچھ اور ظاہر کریں اور اس طرح سمجھ لیں کہ ہم اس کے قانون کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے

ہیں یا اپنی شخصیت کو یکسر چھپانے کی کوشش کریں (تو یہ اس کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے)۔اس لئے کہ جو کچھ یہ چھپائیں اور جو کچھ ظاہر کریں خدا کے قانونِ مکافات پر سب کچھ عیاں ہے۔ وہ تو دل میں گزرنے والے خیالات تک سے واقف ہے (11/5) مفہوم القرآن)۔

صحیح بخاری جلد 6 حدیث نمبر 203 میں محمد بن عباس بن جعفرؓ سے روایت ہے کہ اس نے ابنِ عباسؓ کو آیت (11/5) تلاوت کرتے سنا تو اس کی وضاحت چاہی۔ اس نے کہا کہ کچھ لوگ باہر کھلے آسمان میں رفع حاجت کے لئے جاتے تو اپنے آپ کو چھپاتے تھے اور جب وہ کھلی جگہ آسمان کے نیچے اپنی بیویوں سے جماع کرتے (Sexual relation) تو ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی (11/5)۔

سورہ لقمٰن کی آخری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی اس کا علم خدا ہی کو ہو سکتا ہے اگرچہ اعمال کے نتائج مرتب ہونے کا عمل ہر وقت جاری رہتا ہے۔جس طرح بارش برستی تو ایک وقت پر جا کر ہے' لیکن وہ بنتی شروع ہوگئی ہوتی ہے ایک مدت پہلے سے یا جس طرح بچہ پیدا تو ہوتا ہے ایک وقت خاص پر جا کر' لیکن وہ رحمِ مادر میں بہت پہلے سے مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ خدا کو ان تمام مراحل کا علم ہوتا ہے۔ ان امور (یعنی بارش یا جنین کے مختلف مراحل میں سے گزرنے کا علم تو تم بھی حاصل کر سکتے ہو' لیکن خدا وہ کچھ بھی جانتا ہے جو تم نہیں جان سکتے۔ (مثلاً) کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل (مستقبل میں) کیا کرے گا۔ اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ خدا سب کچھ جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے۔ (اس لئے خدا کو اس بات کا علم ہے کہ ظہور نتائج کی گھڑی کب آئے گی۔ تمہیں اس کا یقین رکھنا چاہئے کہ وہ آ کر ضرور رہے گی۔ (31/34) مفہوم القرآن)۔ آج کل سب جانتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں علومِ سائنس کی رو سے پہلے ہی بتا دیا جاتا ہے کہ بارش کب ہوگی اور ماں کے بطن میں بچہ ہے یا بچی۔ لیکن صحیح بخاری جلد 6 حدیث 219 میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ پانچ چیزوں کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کل کیا ہوگا مگر اللہ۔ کوئی نہیں جانتا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے (بچہ یا بچی) مگر اللہ کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی مگر اللہ۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کس جگہ ہوگی۔ ساعت کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ کب واقع ہوگی مگر اللہ۔ (31/34) آپ قرآن کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں آیت کا ترجمہ اس روایت کے تابع کیا ہوا ملے گا۔

سورہ یٰسین میں ہے کہ والشمس تجری لمستقرلھا ذٰلک تقدیر العزیز العلیم o اس پر بھی غور کرو کہ سورج کس طرح اپنے مستقر کی طرف

رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس خدا کے ٹھہرائے ہوئے اندازوں کے مطابق ہو رہا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے اور جس کا ہر قانون علم پر مبنی ہے (36/38) (مفہوم القرآن)۔

صحیح بخاری جلد 6 حدیث نمبر 326 میں ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ سورج غروب کے وقت میں رسولؐ کے پاس بیٹھا تھا۔ آپؐ نے کہا اے ابو ذر کیا تم جانتے ہو کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ اللہ کے تخت کے نیچے سجدہ میں چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ کا بیان ہے اور پھر آپ ﷺ نے سورہ یٰسین کی مندرجہ بالا آیت کی تلاوت کی (36/38)۔

فرقہ بندی شرک ہے اور پارٹی بازی خدا کا عذاب، یہ روش جن راہوں سے معاشرہ کو جہنمی بنا دیتی ہے ان کے متعلق ہے کہ قل ھو القادر علیٰ ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض انظر کیف نصرف الایت لعلھم یفقھون o غلط نظام کی پیدا کردہ تباہی مختلف شکلوں میں آتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت کی وبا پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیوں میں بٹ جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑنے لگ جاتے ہیں اور یوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو! ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف پہلوؤں سے سامنے لاتے ہیں تاکہ لوگ اچھی طرح بات سمجھ سکیں۔ (6/65) مفہوم القرآن)۔

اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری کی جلد 6 حدیث نمبر 152 میں جبیرؓ سے روایت ہے کہ جب آیت کا پہلا ٹکڑا نازل ہوا تو رسول ﷺ نے کہا اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں (اس سزا سے) جب دوسرا ٹکڑا نازل ہوا تو آپ ﷺ نے کہا اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں (اس سزا سے) اور جب او یلبسکم شیعا و یذیق بعضکم باس بعض نازل ہوا تو رسول ﷺ نے فرمایا یہ ہلکا ہے (آسان ہے)۔ غور کیجئے مسلمانوں میں فرقہ پرستی اور پارٹی بازی کی گرہوں کو کس انداز سے مضبوط کیا گیا۔ اس کی مزید تقویت کی خاطر کہا گیا کہ رسول ﷺ نے فرمایا اختلاف امتی رحمۃ۔ میری امت میں اختلاف باعثِ رحمت ہے۔

سورہ البقرہ کی آیت ہے نسائو کم حرث لکم فاتو حرثکم انی شئتم وقدموا لانفسکم واتقوا اللہ و اعلموا انکم ملقوہ و بشر المومنین (2/223)۔ میاں

بیوی کے جنسی معاملہ میں اس اصول کو یاد رکھو کہ اس سے مقصود افزائشِ نسل (اولاد پیدا کرنا) ہے۔ اس اعتبار سے تمہاری بیویوں کی مثال کھیتی کی سی ہے۔ جس طرح کسان اس وقت تخم ریزی کرتا ہے جب اسے فصل اگانا مقصود ہو۔ اسی طرح تم بھی اس وقت اپنی ''کھیتی'' میں جاؤ جب تم اولاد پیدا کرنا چاہو۔ لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی سمجھ لو کہ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ اولاد پیدا کرنا نہیں۔ اصل مقصود اپنی ذات کی نشوونما کرنا ہے۔ حیاتِ جاوید بقائے ذات سے حاصل ہوتی ہے اولاد کے ذریعے سے نہیں۔ اس لئے تم یہ بھی دیکھو کہ تم نے بقائے ذات کے لئے کیا کیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ہمیشہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھو کہ تم خدا کے قانون مکافات کی زد سے بچ نہیں سکتے تمہیں اس کا سامنا کرنا ہے۔ زندگی کی خوشگواریاں انہی کے لئے ہیں جو اس حقیقت پر ایمان رکھیں۔ (مفہوم القرآن)۔

معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ صحیح بخاری جلد 6 حدیث نمبر 51 میں جبیرؓ سے روایت ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص پیچھے سے اپنی بیوی کے پاس جائے تو اس عورت کے ہاں Squint-eye child (بھینگا) بچہ پیدا ہوگا۔ اس لئے یہ آیت نازل ہوئی! کہ یہ بات صحیح نہیں۔ روایت میں آیت کے جزو کی تفسیر یوں درج ہے کہ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں اس لئے تم اپنی کھیتی میں ''جب اور جس طرح چاہو جاؤ''۔ (2/223)۔

یہ وہ روایت ہے جس نے مجھے اس وقت بیزار (Upset) کر دیا تھا جب میں نے اسے سالوں پہلے اشرف علی تھانوی مرحوم کی تحریر کردہ تفسیر میں پڑھا تھا (اس میں سیدھی یا ٹیڑھی لٹا کر لکھا ہے)۔ میں نے اس کی دو بڑی بڑی جلدیں ہندوستانی تبلیغی جماعت والوں کی مسجد میں یہ کہہ کر بھجوا دیں کہ ان میں آپ لوگوں کے کام کی باتیں لکھی ہیں۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث فاتقوا اللہ یاولی الالباب لعلکم تفلحون (5/100)۔ زندگی کی دو ہی روشیں ہیں۔۔۔ ایک طیب ہے اور دوسری خبیث تم ان میں سے جو روش چاہو اختیار کر لو۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی نہ بھولو کہ وہ روش جو زندگی کے خوشگوار تعمیری پہلوؤں کو ابھارے اور اس کے ثمرات نوعِ انسان کے لئے نشوونما کا باعث ہوں۔۔۔ یہی وہ روش ہے جسے ہم نے طیب کہہ کر پکارا ہے اور وہ روش جو ناخوشگوار تخریبی نتائج پیدا کرے اور اس سے نوع انسان کی نشوونما رک جائے (اسے خبیث سے تعبیر کیا گیا ہے)۔ یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہوسکتیں، خواہ یہ بات تمہارے لئے کتنی ہی تعجب انگیز کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ دنیا میں بالعموم دور دورہ اس دوسری روش کا رہا ہے اور یہی

ہر جگہ چھائی ہوئی ہے (یہ چیز اس روش کے صحیح ہونے کا ثبوت نہیں۔ یہ انسان کی کوتاہ نگہی ہے جو اسے اس بنا پر صحیح قرار دیتا ہے کہ عام چلن اسی کا ہے)۔ لہٰذا تم اگر عقل وشعور رکھتے ہو اور کوتاہ نگہی اور بے بصری سے کام نہیں لیتے تو تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اسی سے تم کامیاب زندگی بسر کرسکو گے۔ (مفہوم القرآن)۔

کلمہ طیب ایک نظریہ زندگی ہے۔ لا الٰـہ الا الـلـہ مـحـمـد رسول الـلـہ۔ اللہ کے سوا کوئی اور صاحبِ اقتدار نہیں There is no Sovereign except Allah محمدﷺ اللہ کے پیغام کو پہنچانے والے اور اس کے مطابق انسانی دنیا میں اللہ کے اقتدارِ حکومت (Sovereignty) کو قائم کرنے والے ہیں تاکہ اجتماعی طور پر اللہ کی یعنی اس کے قوانین کی اطاعت ومحکومیت اختیار کی جائے۔ سورہ ابراہیم میں اس روشِ زندگی' نظریہ حیات یعنی کلمہ طیب کی مثال شجرِ طیب سے دی گئی ہے اور اس کے برعکس خبیث روشِ زندگی کی مثال شجرِ خبیث سے۔ الـم تـر کیف ضـرب الـلـه مثلا کلـمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت و فرعها فی االسماءo توتی اکلها کل حین باذن ربـهـا ويـضـرب الـلـه الامـثـال لـلـنـاس لعلهم يتـذكرون o ومثـل كـلـمـة خبيثة كشجرة خبيثة اجتثـت مـن فوق الارض مـالـهـا مـن قـرار o (14/24-25-26)۔ ذرا غور کرو کہ ان ہر دو متضاد نظریاتِ حیات اور نظامہائے زندگی کو خدا کس طرح ایک مثال کے ذریعے واضح کرتا ہے۔ خوشگوار نظریہ زندگی کی مثال ایک ایسے پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں (پاتال میں) محکم اور استوار ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ (یعنی اسے معاشری زندگی میں مادی تمکن بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ بلند اخلاقی اقدار سے بھی ہمکنار ہو (جن کا سرچشمہ مادی کائنات سے ماوراء ہے)۔ وہ درخت قانونِ خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں ہر وقت پھل دیئے جاتا ہے۔ اللہ اس طرح تجریدی اور نظری حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ اسے اچھی طرح سمجھ جائیں۔ اس کے برعکس' غلط نظریہ زندگی اور نظامِ حیات کی مثال ایک ایسے نکمے درخت کی سی ہے جس کی کھوکھلی سی جڑ' زمین کے اوپر ہی اوپر ہو' کہ اسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ (جو غلط نظام' اخلاقی اقدارِ خداوندی سے ہمکنار نہیں ہوتا' اسے ثبات وقرار نصیب نہیں ہوسکتا)۔

معزز قارئین! اس سے آگے وہ آیت کریمہ ہے جس کی تفسیر ایک روایت کے ذریعے نبی کریمﷺ کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ اس روایت وتفسیر نے ہمارے جذبات وعقیدہ اور اسلاف پرستی سے گہرا تعلق قائم کر رکھا ہے۔ اور آپ کو یہ معلوم ہے کہ کسی کے عقیدہ کے خلاف

بات کرنا ایک ظالم و جابر حاکم کے آگے کھڑے ہونے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ہمیں عقیدہ' جذبات اور اسلاف پرستی سے الگ ہٹ کر' خالی الذہن ہوکر مندرجہ بالا چار آیات اور درج ذیل آیت کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔قرآن کو سمجھنے کے لئے لا یمسہ الا المطھرون کا بھی یہی مفہوم ہے(56/79)۔سورہ ابراہیم کی مندرجہ بالا آیات کے تسلسل میں اللہ نے فرمایا کہ یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و فی الاخرۃ و یضل اللہ الظلمین و یفعل اللہ ما یشاءo (14/27)۔اس طرح اللہ' اس محکم نظریہ زندگی کی رو سے ایمان والوں کی جماعت کو' ان کی دنیاوی اوراخروی زندگی (دونوں) میں' ثبات اور تمکن عطا کر دیتا ہے اور جو لوگ اس نظام سے سرکشی برتتے ہیں' ان کی کوششیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔

بخاری کی جلد 4 حدیث نمبر 450 اور جلد 6 کی حدیث نمبر 221 میں راوی البرا ابن عذیبؓ کی طرف سے سورہ ابراہیم کی مندرجہ بالا آخری آیت 27 کی تفسیر میں روایات کے ذریعے قرآن کریم کا عجب مذاق اڑا رکھا ہے۔ان روایات میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب ایک مسلمان کو اس کی قبر میں بٹھا دیا جاتا ہے تو فرشتے اس کے پاس آتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں اور وہ تصدیق کرتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو پرستش کروانے کا حق نہیں اور محمد ﷺ اس کے پیغمبر ہیں۔ یہ قولِ ثابت ہے یہی مطلب ہے اللہ کے بیان سے۔یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و فی الاخرۃ (14/27)۔''اس آیت کریمہ میں بالقول ثابت سے مراد جماعتِ مومنین کا محکم نظریہ حیات (قرآن) پر استقامت سے عمل پیرا ہونا ہے خدا کی پرستش (Worship) کی تصدیق نہیں۔ خدا کی پرستش تو غیر مسلم بھی کرتے ہیں۔''

معزز قارئین! پھر غور کیجئے کہ آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ اس دنیا کی زندگی اوراخروی دنیا کی زندگی کے متعلق ہے' قبر اور اس میں مسلمان کے زندہ ہوکر بیٹھنے' ملائکہ' سوال' پرستش کے الفاظ نہیں ہیں اوراس آیت میں قبر کے حساب اور قبر کے عذاب کا اشارہ تک نہیں بلکہ پورے قرآن میں قبر میں زندگی' قبر کے حساب وقبر کے عذاب کے لئے ایک لفظ تک نہیں پایا جاتا۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر کتابوں پہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اگر یہ عقیدہ وضع کر کے! اے اللہ فلاں کی قبر کو نور سے منور کر دے۔اے اللہ قبر میں فلاں صاحب کے حساب یا فرشتوں سے سوال و جواب میں آسانیاں پیدا کر دے۔اے اللہ فلاں کی قبر کو جنت کا ٹکڑا بنا دے کی دعائیں مانگنے کے لئے روایات کی ضرورت پیش

آ گئی تھی تو دیگر ہزار ہا احادیث کی طرح کہہ دیا ہوتا کہ حضورﷺ نے ایسا فرمایا تو کافی تھا لیکن کہا یہ گیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضورﷺ نے یہ فرمایا جس پر یقین کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے کہ آپؐ نے ایسا فرمایا ہوگا۔ سورہ المومنون میں انسان کی پیدائش کے مختلف مراحل کے بعد ہے کہ ثم انکم بعد ذلک لمیتون o ثم انکم یوم القیمۃ تبعثون o (23/15-16)۔ پھر اس کے بعد تم سب کو مرنا ہے۔ پھر اس کے بعد تم سب کو یومِ قیامت اٹھنا ہے۔ یعنی دوبارہ زندگی یومِ قیامت ہوگی۔ لہٰذا درمیانی وقفہ میں زندگی یعنی قبر میں اٹھ بیٹھنے کا تصور ہی خلافِ قرآن ہے۔ حضورﷺ نے تو یہ فرمایا تھا کہ میرے بعد تم سے بڑی کثرت سے حدیثیں بیان کی جائیں گی۔ اگر کوئی روایت میری طرف منسوب کر کے بیان کی جائے تو اسے قرآن کے سامنے پیش کرو پھر جو اس کے مطابق ہو اسے قبول کرو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دو۔

سورہ النحل میں ہے کہ جب ملائکہ کسی کو وفات دیتے ہیں تو اسے بتا دیتے ہیں کہ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے یا جنت۔ اس کے بعد قبر میں دوبارہ چیکنگ کی کیا تک؟ یہ عقیدہ ایسے ہی ہے جیسا کہ کراچی ایئرپورٹ سے کوئی مسافر بیرون ملک جاتا ہے تو جہاز میں پہنچنے تک اس کے بیگ کو لگا ہوا ٹیگ ہر دس قدم پر چیک کیا جاتا ہے۔ یہ سب حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر انسان کے نصیب میں قبر نہیں ہوتی۔ کہیں زلزلہ آتا ہے تو نہ معلوم کتنے لوگ ملبے تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔ جنگ کا زمانہ تو اور بھی ہولناک ہوتا ہے۔ آج کل افغانستان اور عراق میں ہر روز بہت سے مردہ انسانوں کو ایک ہی گڑھے میں دبا دیا جاتا ہے۔ ہوائی جہاز گرتا ہے سینکڑوں راکھ ہو جاتے ہیں۔ آخر میں فقہ اور سنن ابو داؤد سورہ البقرۃ کی آیت نمبر 180 میں وصیت ان الفاظ میں فرض کی گئی ہے جن الفاظ میں روزے فرض کئے گئے یعنی کتب علیکم کہہ کر۔ یہ حکم ایسا تاکیدی ہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ اس کی تاکید کی گئی ہے۔ وصیت کے لئے نہ تو یہ کہا گیا ہے کہ اتنے حصے کی وصیت کی جا سکتی ہے اس سے زیادہ کے لئے نہیں اور نہ یہ کہا گیا ہے کہ فلاں کے لئے کی جا سکتی ہے اور فلاں کے لئے نہیں۔ لیکن فقہ میں ہے کہ وصیت تیسرے حصہ کی جا سکتی ہے اور سنن ابوداؤد کی حدیث نمبر 2864 میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورﷺ نے فرمایا لا وصیۃ لــلـــوارث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں کی جا سکتی۔

ایسی ہی تفاسیر پڑھ کر مفکرِ قرآن علامہ اقبالؒ نے کہا۔

زمن برصوفی و ملا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

لمعات

ہماری جامعات کے شعبہ علومِ اسلامی میں خالص قرآن کی روشنی پر مباحث کا ردِ عمل

خالص قرآن کی روشنی میں پیش کئے گئے مقالہ جات پر جامعات میں جن رویوں کا مشاہدہ ہوتا ہے' ان کا تجزیہ ڈاکٹر انعام الحق نے طلوع اسلام کے پچھلے سال کے کنونشن پر پیش کیا تھا۔ اس کا تجربہ ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول میں اپنے مقالہ ''حکمائے مغرب کے نظریہ خیر وشر کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں'' حاصل ہوا تھا۔

اِسے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے:

ان رویوں کے مشاہدہ کا آغاز ڈاکٹریٹ پروگرام میں داخلہ کے لیے تحقیقی خاکہ کو تیار کر کے متعلقہ اتھارٹی کے سپرد کرنے سے ہوا جو خاکہ کا عنوان اور اس کی تیاری میں حصولِ مواد جیسے امور پر بحث کے بعد متعلقہ ڈین کی زبانی اور اُصولی منظوری حاصل کرنے کے بعد کیا تھا۔ لہٰذا اُن کی طرف سے درج ذیل خط کا میرے لیے مایوسی کا باعث ہونا فطری نتیجہ تھا۔ خط کا متن یوں تھا:

> ''آپ کا خاکہ برائے پی ایچ ڈی ''حکمائے مغرب کے نظریہ خیر وشر کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں'' فیکلٹی کی داخلہ کمیٹی میں زیرِغور آیا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ متعلقہ خیر وشر پر قرونِ وسطی میں معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان جو طویل آویزش رہی آپ نے اس سے بالعموم صرفِ نظر کیا ہے اور تفسیری وکلامی ادبیات میں اس موضوع پر جو طویل مباحث ہیں۔ وہ آپ کی نظر میں نہیں ہیں البتہ ان مباحث سے جو نا تمام نتائج غلام احمد پرویز نے اخذ کیے ہیں آپ کا زیادہ تر انحصار ان پر ہے۔ جبکہ یہ امر تحقیق طلب ہے کہ بحیثیت مفسر قرآن جناب غلام احمد پرویز کو اسلامی سکالرشپ میں کیا مقام حاصل ہے؟ اگر اُمت نے ان آرا کو قبول نہیں کیا تو کیا ان کے پیش کردہ نظریے کو قرآن کے تصورِ خیر وشر کا نام دینا درست ہے۔
>
> آپ اس موضوع پر مسلم فلاسفہ ومتکلمین کی تالیفات کا مطالعہ کر کے از سرِ نو خاکہ تیار کریں۔''

ڈین صاحب ماضی قریب ہی میں میرے ایم فل پروگرام کے نگران رہ چکے تھے۔اس حوالے سے اُن سے ذاتی شناسائی کی بنا پر ملاقات رہتی تھی۔ ملاقات کے دوران قرآن کے حوالے سے محترم پرویز صاحب کی تحقیق کا اکثر ذکر رہتا تھا۔قرآن کو قرآن کی رہنمائی میں سمجھنے اور سمجھانے کی روش کو منکرِ سنت کا درجہ دیتے تھے اور پرویز صاحب کی تحقیق کے ذکر پر ناگوار جذبات کے اظہار میں بخل سے کام لینا کفر سمجھتے تھے۔خط پا کر البتہ حیرانی اس بات پر ہو رہی تھی کہ وہ زبانی گفتگو کی نجی حدود پھلانگ کر اپنی سرکاری حیثیت کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تحریری طور پر اپنے تعصب کو باہر لا رہے تھے۔اس لیے مناسب یہی سمجھا کہ تاخیر کیے بغیر اُن کو اُسی روز مناسب جواب ارسال کر دیا جائے۔لہٰذا درج ذیل جواب اُن کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔

''آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری درخواست کو پی ایچ ڈی پروگرام کے لیے موزوں قرار دیا۔آپ نے البتہ داخلہ کمیٹی کے اعتراضات کی بنا پر مسلم فلاسفہ و متکلمین کی تالیفات اور قرونِ وسطیٰ میں معتزلہ اور اشاعرہ کے درمیان طویل آویزش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تلقین کے ساتھ کہ محترم غلام احمد پرویز کے نظریات سے پرہیز بھی ہو' از سر نو خاکہ تیار کرنے کو کہا ہے۔

اس ضمن میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے' میں نے تو خاکہ میں ایک طرف صرف حکمائے مغرب اور دوسری جانب سے قرآن کا نظریہ خیر و شر کا تقابلی جائزہ' مختصر الفاظ میں بطور تعارف پیش کیا تھا جس میں حتی الوسع مغربی مفکرین کی آرا کا جائزہ قرآن ہی سے پیش کرنے کا عنوان باندھا تھا۔

یہ کوشش اور مقالہ کا عنوان قرآن ہی کی ہدایت کی روشنی میں انتخاب میں لایا گیا تھا' جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا جواز بھی پیدا کرنا تھا کہ قرآن اپنا مفہوم خود واضح کرنے کی دسترس رکھتا ہے بشرطیکہ تحقیق کا مدار انسان کی اپنی کاوش سے فکر و تدبر اور عصری علوم میں آگاہی سے حاصل ہو۔اس کے لیے نہ تو علم کو کسی بھی مکتبِ فکر سے محدود کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی محروم جبکہ اس کی سند میں دلیل بھی اُمت کا قبول ہونا قرار پایا جائے۔

قرآن کے طالب علم کے لیے (اُمت کے لیے قابلِ قبول ہونا) یہ دلیل تو سند نہیں ہو سکتی۔قرآن نے انسان کی ذاتی کاوشوں سے بلا جبر اخذ کیے ہوئے علم کو تحقیق کے لیے بطور معیار پیش کیا ہے۔ارشادِ باری ہے کہ:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

(بنی اسرائیل 17:36)

کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً تمھاری سماعت و بصارت اور دل (Mind) ''یعنی انسان کے اپنے ہی ذرائع علم'' سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔

قرآن نے اس کے علاوہ بڑے واضح انداز میں اُمت کی آرا کو انسان پر مسلط کرنے سے روکا ہے۔

تِلْکَ اُمَّۃٌ قَدْ خَلَتْ لَھَا مَا کَسَبَتْ وَ لَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

(البقرہ2:134)

یہ امت تو گزر چکی ہے جو انھوں نے کیا تھا وہ اُن کے لیے ہے اور جو تم کرو گے تمھارے لیے ہے اور اُس کے متعلق تم سے باز پرس نہ کی جائے گی جو وہ کرتے تھے۔

اگر آپ اپنے اعتراضات کے ضمن میں جواب سے ابھی بھی مطمئن نہ ہوں اور اپنے فیصلے پر مُصر ہوں تو اس ضمن میں مجھے اُمید ہے آپ میری دوسری تجویز پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ قرآن کے طالب علم ہونے کے ناطے سے میں نے ہندو پاک کے سبھی مفسرین اور بالخصوص پرویز صاحب کی قرآن پر تحقیق کا برسوں سے بغور مطالعہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مجھے پرویز صاحب کی قرآنی تحقیق کا جائزہ لینے پر اپنے مقالہ کے عنوان کو مرتب کرنے کی اجازت دی جائے تو یہ تعمیری کاوش نہ صرف قرآنی فکر پر مزید تحقیق کے لیے ممد و معاون بلکہ آپ کے وضع کردہ اُصولوں کے مطابق یونیورسٹی کے لیے فکر و تدبر لیے ہوئے عصری تقاضوں پر مبنی ایک مقالہ کا اضافہ اور مفید اضافہ ثابت ہوگی۔

اس وجہ سے میں آپ سے بار بار گزارش کرتا رہا ہوں کہ آپ پرویز صاحب کا نام سُنتے ہی میری تجویز کو رد کرنے کی بجائے اُمت کی آرا کو صرفِ نظر کرتے ہوئے میرٹ پر مجھے پرویز صاحب کے کام پر تحقیق کرنے کی اجازت اُسی طرح دے دیں جیسی آپ دوسری شخصیات کے کاموں پر دے رہے ہیں۔ اُمید ہے اب آپ اسلاف کے دباؤ سے نکل کر میرٹ پر میری درخواست پر فیصلہ لیتے ہوئے مجھے مطلع فرمائیں گے تاکہ میں جلد از جلد خاکہ مرتب کرکے آپ کو ارسال کرسکوں۔''

اب مقالہ کی تحقیق کے لیے منظوری سے نوازے جانے کا خیال تو دل سے نکال دیا تھا' لیکن اطمینان ضرور تھا کہ جو صحیح سمجھا' اُسے واضح طور پر آگاہ کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اس لیے جلد ہی اس خط و

کتابت کو ماضی کا حصہ سمجھتے ہوئے بھلا دیا۔ میرے لیے یہ خوشگوار حیرت کا باعث بنا' جب ایک دن یونیورسٹی کی کمیٹی فار ایڈوانس سٹڈیز اینڈ ریسرچ (Committee for Advance Studies and Research) کی طرف سے بلامشروط تحقیق کے لیے خاکہ کی منظوری کی اطلاع ملی۔

پہلا ردِعمل فوری طور پر اظہارِ تشکر کے لیے ڈین صاحب کے دفتر میں حاضری دینے کی شکل میں ہوا۔ میری آمد پر ڈین صاحب نے اپنائیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے رفقا کار کو اُسی وقت اپنے کمرہ میں بلا کر باقاعدہ چائے کا اہتمام کر کے ایک تقریب منعقد کر ڈالی۔ اس تقریب کو میری فکرِ پرویز سے رہائی کے لیے اجتماعی دعا کے رنگ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس غیر متوقع تقریب کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا' پھر بھی دبے الفاظ میں احتجاج ریکارڈ کرانا مناسب سمجھا کہ وہ لوگ زندہ انسان کی موجودگی میں اُسی کے سامنے اُسی کی ''فاتحہ'' پڑھوا رہے ہیں۔ اس پر ڈین صاحب نے تسلی دینے کے انداز میں اسی رسمِ ''فاتحہ'' کو آخرت کے تناظر سے خارج کرتے ہوئے دعائیہ تقریب کا ہی ایک لازمی حصہ کے طور پر متعارف کرایا۔ اُن کی یقین دہانی کے باوجود میرے حساب سے وہ اصحاب بے خیالی ہی میں سہی مروجہ رسم ''فاتحہ'' ہی کی ادائیگی کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔

لہٰذا میں نے علامہ اقبال کے تصورِ دعا کو اُن کا یہ شعر سامنے لا کر وضاحت کرنے کی مزید کوشش کی:

تری دُعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

علامہ کے اس تصور کی رُو سے دُعا میں تو مخصوص انسان اپنی دلی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی لانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ آپ اصحاب تو اظہارِ تمنا تو دُور کی بات ہے' اُس زندہ موجود فرد کو اس اجتماعی دُعا میں شریک کرنے کی زحمت گوارا کرنا بھی ضروری خیال نہیں کر رہے۔ ڈین صاحب نے علامہ اقبال کے تصور سے متاثر ہونے کا تاثر دیئے بغیر بات ختم کرتے ہوئے وضاحت کی کہ اجتماعی دعا میں ہر کس و ناکس کی شمولیت کو نہ صرف روکا نہیں جاتا' بلکہ شرکت کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے۔

اس تقریب کے ختم ہونے سے پیشتر البتہ ڈین صاحب ہی کے رفیق کار نے پُرانے اعتراض کو دُہراتے ہوئے تکلف کیے بغیر ذہن نشین کرانا فرض سمجھا کہ خاکہ میں منظوری کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول

کے لیے پہلی سیڑھی عبور کرنے کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔اس کے لیے انھوں نے واشگاف الفاظ میں ''پرویزیت'' سے مکمل اجتناب کو ایک بلامشروط تقاضا کے طور پر سامنے رکھا۔میرے اصرار پر مزید تصریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس تقاضا کو تحریر میں لانا بھی وہ ضروری نہیں سمجھتے' کیونکہ یہ understood ہے۔

اُن کے تیور میں مُلا کی سوچ بھانپ کر' میں نے دلائل و بُراہین کی گفتگو کی مشق کو بے سود سمجھتے ہوئے خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔البتہ علامہ اقبال کے درج ذیل شعر کو دل ہی دل میں دُہرانے کی تمنا کو روک نہ سکا۔

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب

لوگوں کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ مکتب ملا کا تصور علامہ اقبال نے مسجد کے امام کے رویہ کے تناظر میں پیش کیا ہے اور یہ کہ مکتب وملا اور یونیورسٹی کے اسلامی سکالرز کی سوچ میں فرق ہے۔ان میں فرق سمجھنے والے زیادہ تر وہ اصحاب ہوتے ہیں جن کو ان اسلامی سکالرز کی سوچ اور رویہ کا ذاتی تجربہ نہیں ہوتا۔اس لیے ان کو حسنِ ظن ہوتا ہے۔اس ضمن میں اپنا ذاتی تجربہ بیان کرنے سے قبل یہاں میں محترم پرویز صاحب کا تبصرہ بیان کرنا چاہوں گا۔

علامہ موصوف اپنے ہفتہ وار درسِ قرآن میں مزاح میں بھی احتیاط برتتے تھے کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو۔اس لیے دورانِ درسِ قرآن یہ سُن کر تعجب ہوا جب وہ فرما رہے تھے کہ اگر آپ نے کسی کو دین سے برگشتہ کرنا ہو' تو اُسے یونیورسٹی میں ایم-اے(اسلامیات) کی کلاس میں داخلہ دلوادیں۔سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ شاید وہ مذاق کے موڈ میں ہیں' لیکن بی-اے اور ایم-اے کی اسلامیات کی کلاسز کو مروجہ نصاب کی رہنمائی میں گائیڈنس دیتے وقت احساس ہوا کہ معمول کے مطابق وہ حقیقت ہی کا اظہار کر رہے تھے۔

ملکی وغیر ملکی جامعات کے اساتذہ کے اندازِ تدبر کا تقابلی جائزہ

اس ضمن میں البتہ یہ جان اور سمجھ کر حیرت لیکن تسلی ہوئی کہ ہمارے ملک کی جامعات کے اساتذہ اور غیر ممالک کے اساتذہ کی سوچ میں بہت فرق ہے۔غیر ملکی میرٹ پر فیصلہ اور تبصرہ کرتے ہیں جبکہ ہمارے اساتذہ وہی دیرینہ ملائی تعصب کے دائرے سے اپنے آپ کو نکال نہیں پائے۔لہٰذا یہاں میں اس کے ثبوت

میں اپنے مقالہ میں دونوں طرف سے جو آرا ملی تھیں، اُن کے اہم مندرجات نقل کر کے آپ کے سامنے لا رہا ہوں جو ایک ہی تحقیقی مقالہ پر دی گئی ہیں۔

پہلے غیر ملکی دانشور کی رپورٹ

Undoubtedly, the mature researcher has done a very good work on the subject. His discussions on the philosophical expositions of western scholars with regard to various constituents of the basic concepts of Good and evil are remarkably woven into a systematic study followed by the Quranic concepts of each and every constituent.

However, the researcher has accumulated all the relevant material on the subject and other researcher may utilize the material to present a coherent and synthesized thesis on the Islamic concepts of Good and evil.(Which is the purpose of writing this book) Some of his interpretations are quite novel such as the theory of ASMA in the Quran; one may agree or disagree with them,but cannot ignore them.

بلا شک وشائبہ، بالغ نظر مقالہ نگار نے اپنے موضوع سے نہایت احسن طریقے سے پورا انصاف کیا ہے۔ حکمائے مغرب کے خیر و شر کے فلسفیانہ تصورات کی روشنی میں اُن کے ہر زاویہ نگاہ کو مقالہ نگار نے قرآن کے تصورات سے تقابل میں ایک منظّم مطالعہ کی صورت میں اپنی بحث میں یکجا کر دیا ہے۔

مقالہ نگار نے اپنے موضوع سے متعلق دستیاب مواد اپنے مقالہ میں اکٹھا کر دیا ہے۔ لہٰذا مستقبل کے تحقیق نگاروں کے لیے مقالہ نگار کے مواد سے فائدہ حاصل کرنے اور نظریہ خیر و شر کے ایک ہم آہنگ ترتیب پر مبنی اسلامی تصور کو اپنے مقالوں کی ترکیب دینے کے لیے آسانی مہیا ہو گئی ہے۔ (اسی مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے) مقالہ نگار کی بحث کے کچھ پہلو یا توجیہات رائج الوقت روش سے یقینی طور پر الگ ہیں، جیسے قرآن سے اسمائے الحسنٰی کا نظریہ۔ بہرحال مقالہ نگار کے نظریات سے اتفاق و اختلاف کا حق سبھی کو ہے، لیکن ان نظریات کو نظر انداز کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔

دوسرے غیر ملکی دانشور کی رپورٹ

It seems an original contribution in the field of Islamic thought and philosophy. In my humble opinion, this is perhaps the first work done in Quranic perspective. The theory of good and evil as advocated by the west is analysed in the light of Quran and the guidelines of Holy Quran in this regard are presented well.
The conclusions drawn by the scholar in the thesis in general and in the chapters 7, 8 and 9 in particular may be differed in certain points, but these are acceptable in general. The scholar has tried his best to deduce some of the philosophical notions on the theme from the Holy Quran. In his nobile effort the scholar is successful.

I, therefore, recommend the thesis for the publication also.

نظر آ رہا ہے کہ اسلامی فکر اور فلاسفی کے میدان میں مقالہ ہذا خشتِ اوّل کا بنیادی فریضہ ادا کر رہا ہے۔ میری مؤدبانہ رائے میں یہ کوشش خالص قرآن کی روشنی کے تناظر میں شاید اوّلین تخلیق میں شمار ہوگی۔ حکمائے مغرب کے خیر وشر کے پیش کردہ نظریات کا تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا گیا ہے اور قرآنی ہدایات و راہنمائی کو نہایت عمدگی سے بیان کر کے وضاحت کی گئی ہے۔

سکالر نے مقالہ میں عمومی لیکن خصوصی طور پر باب نمبر 7,8,9 سے نتائج اخذ کرتے وقت رائج الوقت نظریات سے کچھ نکات میں عموم سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان اختلافات کو عمومی قبولیت حاصل ہے۔ سکالر نے موضوع سے متعلق مسلمہ روایات کا قرآن کی روشنی میں فلسفیانہ استخراج کرنے میں اپنی بہترین صلاحیتوں سے کام لینے کے اظہار کا ثبوت دیا ہے اور اپنی عظیم المرتبت کوشش میں کامیاب رہا ہے۔

لہٰذا میں اس مقالہ کو شائع کرنے کی سفارش کرتا ہوں۔

ملکی سکالرز کی سوچ کا ملائی زاویہ نگاہ

اس کے برعکس ملکی سکالرز کی آرا میں ڈین کے خط کا آپ اُن کی آرا سے پہلے ہی متعارف ہو چکے ہیں۔ اب یہاں ملکی سکالر

کی مخصوص تناظر میں اُس رائے کو نقل کیا جا رہا ہے جو اُس نے مقالہ کی جانچ میں اپنی رپورٹ میں دی ہے۔

''مقالہ نگار نے باوجودیکہ محنت سے مواد اکٹھا کیا' لیکن آپ کا مقالہ ایک خاص مکتبِ فکر کی نمائندگی کر رہا ہے۔ آپ نے اپنے موضوع سے متعلق نہ تو معروف متداوّل تفاسیر سے مدد لی اور نہ ہی موضوع سے متعلق دوسرے معاصرین کی لکھی ہوئی کتابیں جیسے مولانا امین اصلاحی اور مولانا مودودی کی کسی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے مقالہ میں کسی ایک مکتب فکر کی آرا کی بجائے اپنے موضوع سے متعلق تمام آرا کو جمع کریں''۔

دونوں کے تقابل میں نظر آ رہا ہے کہ غیر ملکی سکالرز نے مقالہ کو کسی مکتب فکر کی نمائندگی سے منسلک کرنے کی روشنی سے ہٹ کر' اسے خالص قرآن کی روشنی میں اوّلین فکری تخلیق شمار کرتے ہوئے ایک مستحسن علمی کاوش قرار دیا۔ البتہ ہمارے ملک کے سکالرز نے اُمید کے مطابق اس قرآنِ خالص کی فکر کو فرقہ ورانہ رنگ دینے میں مکتب وملا کی روشنی میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔

ملکی سکالرز کے تیور بھانپ کر مقالہ نگار نے مقدمہ میں اسلوبِ تحقیق کے عنوان کے تحت احتیاط کے طور پر وضاحت کر دی تھی کہ مقالہ میں ''علامہ اقبال ہی کی بصیرتِ قرآنی سے مقالہ میں اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہیے اور اس پر خارجی عناصر کو اثر انداز نہیں ہونے دینا چاہیے۔

اس وضاحت کے باوجود ہمارے اپنے ملک کے سکالرز صرف قرآن کی روشنی میں پیش کی گئی جسارت کو ہضم نہ کر سکے اور مقالہ نگار کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ مقالہ میں ہر مکتبِ فکر کی آرا کو یکجا کرے۔ اس پر مقالہ نگار نے اس مناظرانہ روش اختیار کرنے سے معذرت کا اظہار کیا تو اس معذرت کو قبولیت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ سزا کے طور پر مقالہ نگار کو ہر ممکن انتظامی رکاوٹوں کا سامنا کرتے ہوئے ڈاکٹریٹ کے مختلف مرحلوں سے ڈگری کے اجرا کے حصول تک معمول سے مزید پانچ سال کے انتظار کی کوفت برداشت کرنا پڑی۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود' یونیورسٹی کی سطح کے اساتذہ کے ملائی ذہنوں میں تبدیلی لانے میں ناکام رہا۔ اس عرضداشت کے ذریعے میں یہاں طوالت اور مشکلات کے سامنا کرنے کے ذکر کو اہم نہیں سمجھتا بلکہ مستقبل کے محققین کے لیے لمحہ فکریہ چھوڑے جاتا ہوں کہ وہ خود کو ملائی سوچ کے ذہن کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھیں اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے اپنا فریضہ ادا کرنے میں بھرپور حصہ لیں۔ مسئلہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ذہن کی تبدیلی کا ہے۔ اس کے بعد نتائج خود بخود آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(تیسرا باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیات 1 تا 2)

اللہ تعالیٰ کی ذات حمد کی مستحق کیوں ہے؟

عزیزانِ من! آج کا درس سورۃ الفاتحۃ کے تیسرے لفظ ''رب'' سے شروع ہوتا ہے۔ اس سورۃ کا آغاز ہے الحمدللہ اور اس کے بعد ہے رب العالمین۔ حمد اور اللہ کے متعلق ہم پہلے درس میں دیکھ چکے ہیں۔ اب رب العالمین میں رب کا لفظ آیا ہے۔ اس کی اہمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ہر قسم کی انتہائی مکمل شکل کی حمد' اللہ کے لیے ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ کیوں اس قسم کی حمدیت کا مستحق ہے؟ اس لیے کہ وہ رب العالمین ہے۔ تو گویا یہ جو اس کا ''رب'' ہونا ہے' اسے ربوبیت کہا جائے گا۔ اس کی ربوبیت وہ بنیادی علت یا Cause یا سبب ہے' جس کی وجہ سے کہا گیا ہے کہ ہر قسم کی حمدیت اسی کے لیے ہے۔ آپ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ یہ رب کی صفتِ خداوندی کتنی محیطِ کل ہے' کتنی وسیع ہے' کتنی گہری ہے کہ یہی بنیادی طور پر اس کی حمدیت کا باعث بنتی ہے۔ اس ربوبیت کی تفاصیل قرآنِ کریم کے مختلف مقامات پہ' مختلف انداز میں آئیں گی لیکن اس کا بنیادی نکتہ یہی ربوبیت ہی ہے۔

لفظ 'رب' کے مفہوم کی وضاحت

عزیزانِ من! مادے کے اعتبار سے رب کا مادہ ''ر ب ب'' ہے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں: ''نشوونما دینا یعنی کسی چیز کو نئی نئی تبدیلیوں سے' اس طرح گزارنا' کہ وہ بتدریج (Gradually) نشوونما پاتی ہوئی اپنے نقطۂ آغاز سے تکمیل تک پہنچ جائے''۔ یہ طریقِ نشوونما ربوبیت کہلاتا ہے اور اس طرح نشوونما دینے والے کو رب کہا جاتا ہے۔ اس طریقِ نشوونما میں اصلاح' درستگی اور استحکام کے پہلو بھی مضمر ہوتے ہیں' پھر چونکہ نشوونما کا لازمی نتیجہ شگفتگی اور شادابی ہے' اس لیے عربوں کے ہاں ''الـرُّبَّۃُ'' ان پودوں کو کہتے تھے' جن کی سرسبزی اور تازگی' سردی اور گرمی' ہر موسم میں' یکساں رہتی ہے۔ ان تصریحات سے رب کے بنیادی معنی واضح ہو جاتے ہیں یعنی کسی شے کو نقطۂ آغاز سے نشوونما دیتے ہوئے پایہ تکمیل تک پہنچنے والا' انتظام کرنے والا' اصلاح کرنے والا' آگے بڑھانے والا' اور اس انداز

سے آگے بڑھانے والا کہ اس شے کی سرسبزی اور تازگی موسم کے تغیرات سے بھی متاثر نہ ہو اور جو کچھ اس نے بننا ہے وہ کچھ بطریقِ احسن بن جائے۔ ایسا کرنے والا رب کہلاتا ہے۔

یہ محسوس کائنات' جو ہمارے سامنے ہے یا وہ محسوس کائنات' جو ہمارے سامنے تو نہیں ہے لیکن اس لامنتہیٰ سلسلہ کائنات میں پھیلی ہوئی ہے' کس طرح عدم سے وجود میں آ گئی' اس کا جواب فکرِ انسانی سے ممکن نہیں۔ نظامِ فطرت میں قانونِ علت ومعلول یعنی Law of Cause and Effect جاری وساری ہے۔ یعنی یہاں جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ کسی سبب (Cause) کا نتیجہ (Effect) ہوتا ہے۔ طبعی سائنس (Physical Science) ہماری علت (Effect) اور معلول Cause کی کڑیوں کے دریافت کرنے کا نام ہے۔ یہ محققین ان کڑیوں کو پیچھے لے جاتے ہیں اور اپنی اس تحقیق میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن اس میں بالآخر ایک ایسا مقام آ جاتا ہے جہاں یہ کائنات تو موجود نظر آتی ہے' لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس طرح وجود میں آ گئی۔ یعنی وہاں Effect (معلول) ہوتا ہے' اس کے Cause (سبب) کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بڑے سے بڑا سائنسدان بھی اس مقام پر اسی طرح دانتوں میں انگلی دبائے محوِ حیرت کھڑا دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک جاہلِ مطلق۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق کے کائناتی سلسلہ میں عقلِ انسانی محوِ حیرت ہے

عزیزانِ من! ہم نے اللہ کے عنوان میں دیکھا تھا کہ الٰہ کے ایک معنی ''متحیر ہو جانا'' بھی ہے۔ آغازِ کائنات وہ مقام ہے جس کا تعلق خدا کی شانِ الوہیت سے ہے۔ یعنی وہ مقام کہ جہاں پہنچ کر عقلِ انسانی محوِ حیرت ہو جاتی ہے کہ Nothingness (معدوم) سے یہ چیز کیسے وجود (Being) میں آ گئی۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے دو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق کہا ہے کہ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (2:117) اور دوسرے مقام پہ ہے کہ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (6:14)۔ ان دونوں لفظوں کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی شے کو بغیر کسی سابقہ مسالے (Material) کے وجود میں لانا: علت (Cause) اور معلول (Effect) کے بغیر آغازِ کائنات کرنا۔ وہ خدا کی صفت ''بدیع السمٰوٰت والارض'' یا ''فاطر السمٰوٰت والارض'' کی مرہونِ منت ہے۔ اور یہ ہم کہہ ہی نہیں سکتے کہ یہ کس طرح سے وجود میں آئی۔ ہم اس مقام پر عالمِ تحیر میں ہوتے ہیں۔ یہ جو علت ومعلول سے کوئی شے وجود میں آ جاتی ہے تو اس کے لیے عربی زبان میں لفظ ''خلق'' ہے۔ اور اس سے پہلا جو اس کا مقام ہوتا ہے' وہ مراحل ہوتے ہیں' جو اس کے وہ عالمِ امر کہلاتا ہے۔ ایک یورپین مفکر پٹیسن ❶ نے کہا ہے کہ عربی زبان ہمارے مقابلے میں بڑی

---

❶ Pringle-Pattison (1856-1931) پرنگل پٹیسن کے اپنے الفاظ اور تخلیق اور امر کے مفہوم کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان پارہ 29 (مکمل) ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2006ء' ص ص 446 تا 448' نیز ص 446 کا فٹ نوٹ 1' نیز: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005ء' ص ص 142 تا 145

Advantgeous (افادی) پوزیشن میں ہے کہ اس کے ہاں Creation (تخلیق) کے لیے دو الفاظ ہیں: ایک امر اور دوسرا خلق لیکن ہمارے ہاں اس کے لیے صرف ایک ہی لفظ Creation (تخلیق) ہے' حالانکہ Creation (تخلیق) وہاں آئے گا جہاں کوئی شے محسوس طور پر سامنے آ جائے لیکن اس کے محسوس طور پر سامنے آنے سے پہلے جو مراحل ہیں' ان کے لیے ہماری زبان میں کوئی لفظ ہے ہی نہیں۔ یہ عربی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس میں اس کے لیے بھی ایک لفظ موجود ہے۔ یہ قرآن کریم کی خصوصیت ہے کہ اس نے عالمِ امر اور عالمِ خلق دو الگ الگ عالم بتائے ہیں۔

عالمِ امر کے متعلق یوں سمجھیے کہ جیسے کسی ایجاد کرنے والے کے ذہن میں پہلے ایک تصور آتا ہے' ایک نقشہ آتا ہے' وہ شے ابھی محسوس طور پہ وجود میں نہیں آئی ہوتی لیکن اس کے متعلق وہ ڈیزائن (Design)' وہ ڈائریکٹنگ (Directing)' وہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ ❶ لفظ امر کے معنی ہی ڈائریکشن (Direction) کے ہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق انگریزی زبان میں سمجھانے کے لیے Direction کہا جاتا ہے' جہاں پہ الفاظ تو ہم انسان کے ذہن کے ہی کہہ سکتے ہیں' جہاں وہ اپنے ذہن میں' اپنے تصور میں' شے کا نقشہ مرتب کرتا ہے ابھی وہ شے اصل میں وجود میں نہیں آتی۔ لیکن جب وہ شے اس نقشے کے مطابق وجود میں آتی ہے تو وہاں سے عالمِ خلق شروع ہوتا ہے۔ خلق کے معنی ہوتے ہیں: جو چیزیں مسالے (Material) کے طور پہ موجود ہوں' اُن میں مناسب نشوونما سے'

---

❶ 1934ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام ہے The Great Design۔ اس کے مدیر F.Mason نے دنیا بھر کے ائمہ فکر ونظر کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے اپنے شعبہ علم کی تحقیقات کو سامنے رکھ کر غیر جانبدارانہ طور پر یہ بتائیں کہ ان کے نزدیک اس کائنات میں کوئی نظم و ربط ہے یا یہ سلسلہ یونہی اندھادھند چلے جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی دعوت پر مختلف علوم وفنون کے ماہرین نے الگ الگ مقالے لکھے جو اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے۔ نباتات' حیوانات' انسانیات' طبیعات' حیاتیات' نفسیات' فلکیات وغیرہ تمام شعبوں کے ماہرین کے مقالات۔ ان میں سے ہر مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ سائنس کی تحقیقات اس حقیقت کو دن بدن بے نقاب کیے جا رہی ہیں کہ یہ تمام سلسلہ کائنات' عجیب وغریب نظم وضبط کے ماتحت جاری وساری ہے۔ یہ سب کچھ حیرت انگیز ڈیزائن (Design) سے ہو رہا ہے۔ جس میں کوئی سقم نہیں' کوئی جھول نہیں' کوئی دراڑ نہیں' کوئی سلوٹ نہیں۔ ایک Design اور Plan کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کائنات کی ابتدا کے بارے میں بحث کرتے ہوئے (Lick Observatory, California (کیلیفونیا کی لک مشاہدہ گاہ) کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ایٹکن (Dr. Aitken) نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ:

"The origin of the universe and its ultimate fate, we know practically nothing" (The Great Design,p.35)

یعنی ''کائنات کی ابتدا اور اس کی انتہائی کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔'' شین (Sheen) نے تو فلسفہ مذہب (Philosophy of Religion) کے صفحہ 156 پر سلیوان (Sulivan) کے یہ الفاظ Quote کیے ہیں کہ ''سائنس' کتاب فطرت کو پڑھتی ہے اسے لکھتی نہیں لیکن اس کتاب فطرت کے مطالعہ کرنے والوں کا اعتراف ہے کہ سائنس محض سطح کائنات کی کتاب خوانی ہے' اس کی کنہ وحقیقت کا علم اس کے اندر ہے ہی نہیں۔ نہ ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ریڈنگ یونیورسٹی کا طبیعات کا پروفیسر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کروتھر لکھتا ہے کہ ''نظامِ فطرت اپنی گہری بنیادی سادگی میں اس قدر تحیر انگیز ہے کہ دنیائے سائنس میں کسی موضوع پر حرفِ آخر انسان کے لیے ہی چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ (The Great Design, p. 52)

صحیح صحیح Proportion (تناسب) سے نئی نئی چیزیں بناتے چلے جانا۔ اسی لفظ ''خلق'' سے لفظ اخلاق ہے' جس کے معنی صحیح Proportion (تناسب) کے ہیں' یعنی انسانی صلاحیتوں کا' انسانی استعداد کا' صحیح صحیح Proportion (تناسب) میں ہونا۔ یہ جو صحیح ترین Proportion (تناسب) کے اندر ہوتا ہے آپ کو معلوم ہے کہ وہ Personality (شخصیت) کے لیے یہ لفظ آیا ہے کیونکہ اس میں Proportion (تناسب) بالکل صحیح ہوتی ہے۔ لہٰذا خلق کے معنی ہوتے ہیں: پہلے سے موجود شے میں نئی نئی Proportion' (تناسب) سے' نئی نئی چیزیں' وجود میں لاتے چلے جانا۔ یہ چیز ہے جس کے لیے ابتدا میں آپ یوں کہیے' کہ اس شے کا صرف' میٹریل موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے کمہار کو دیکھا ہوگا' اس کا چاک بھی دیکھا ہوگا' اس کے پاس مسالہ (Material) کیا ہوتا ہے: گوندھی ہوئی مٹی ہوتی ہے' لیکن اس مٹی سے اس نے بنانا کیا ہے' کس قالب میں ڈھالنا ہے' کیا چیز تیار کرنی ہوتی ہے۔ وہ اس کے ذہن میں ہوتی ہے۔ وہ اس مٹی کو چاک پر رکھتا ہے اور پھر اس میں صحیح تناسب پیدا کر کے کبھی پیالہ بنا دیتا ہے' کبھی صراحی بنا دیتا ہے' کبھی چینک بنا دیتا ہے۔ عجیب عجیب چیزیں اس میں سے نکلتی چلی جاتی ہیں۔ وہی جو کسی چیز کے بنانے کے لیے مٹی کا تودہ سا رکھا ہوا تھا' تو اس کے ذہن میں کسی چیز کے بنانے کا ایک نقشہ یا تصور ہے۔ اس کے مطابق وہ' اس میٹریل سے' یہ نئی نئی چیزیں بنائے چلے جاتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ وہ بت یا معبود' جس کی پرستش ہندو کرتا ہے' وہ پتھر کی چٹان کے اندر چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ یہ سنگ تراش کا ذہن ہے' جو پہلے اس شے کا نقشہ مرتب کرتا ہے اور پھر اس پتھر سے حشو زوائد کو الگ کرتے ہوئے اس میں سے وہ حسین وجمیل ایک ایسی شے تراش دیتا ہے جس کے سامنے یہ یوں کہیے کہ اس یہ کچھ کرنے والے کا سرِ نیاز' جھک جاتا ہے۔ وہ تو اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر' نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

قرآنی الفاظ 'الباری' اور 'المصور' کا مفہوم

وہ اس شے کو جو ابھی Creator (خالق) کے Mind (ذہن) میں ہوتی ہے' معاف رکھیے خدا کے لیے اب ہم یہی لفظ استعمال کر سکتے ہیں' اب ہم کیا کریں' ہماری زبان کی' بلکہ فہم کی' ادراک کی' شعور کی مجبوری ہے' ہمارا ذہن محدود (Finite) ہے اور خدا تو (Infinite) (لامحدود) ہے۔ Infinite (لامحدود) کے لیے جب Finite (محدود) کے الفاظ استعمال کریں گے' تو وہ صحیح صحیح معنوں میں' صحیح صحیح انداز میں' اس کا مفہوم ادا نہیں کریں گے لیکن ہم کیا کریں' اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں ہے۔ بنتی نہیں ہے بادۂ وساغر کہے بغیر۔ تو اس مٹی کے تودے کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات ہوتے ہیں' اس کمہار کا ہاتھ اس اپنے پہلے سے ذہن میں رکھے ہوئے نقشے کے مطابق' اسے بنائے چلا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی دو صفات ہیں: الباری اور المصور۔ باری کے

معنی ہوتے ہیں ''کسی شے میں جو زائد چیزیں ہوں' ان کو الگ الگ کرتے چلے جانا' اور پھر اُن کو اس تصویر کے مطابق بنا دینا' جو اس کے ذہن میں ہوتی ہے''۔ کائنات جس شکل میں ہمیں نظر آتی ہے' اس کا نقطہ آغاز اسی قسم کا نہیں ہے۔ یعنی جو شے جس شکل میں ہمیں آج نظر آتی ہے' وہ شروع میں ہی اسی قسم کی نہیں تھی۔ یہ نہیں تھا کہ ہر شے اسی شکل میں اللہ تعالیٰ نے کسی طرح پیدا کر دی جس طرح آج نظر آتی ہے۔

انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل

مثلاً انسان جس شکل میں آج موجود ہے' یہ بات نہیں تھی کہ پہلا انسان خدا نے اسی قسم کا بنا دیا۔ وہ جو آدم کی تخلیق کے متعلق ہمارے ہاں عام طور پر روایتیں اور قصے مشہور ہیں' وہ حقیقت نہیں ہیں۔ وہ تراش کے دیئے ہوئے قصے ہیں۔ قرآن کے نہیں ہیں۔ قرآن اسے نہیں مانتا کہ پہلے سے' اسی طرح سے' ایک انسان کا پتلا بنا دیا۔ پھر اس کی پسلیچیر کر اس میں سے ایک حوا' اس کی بیوی' نکال دی۔ یہ نہیں ہے۔ مثلاً انسان ہی کو آپ لیجیے یا Life (زندگی) کو لیجیے۔ کسی بھی زندہ چیز کا آغاز ایک لائف سیل سے ہوتا ہے جو Naked (خالی آنکھ) سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا۔ اس قسم کا وہ سیل (خلیہ) ہوتا ہے Microscopically (خوردبین سے) اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سیل (خلیے) کے اندر جیتا جاگتا انسان بننے کے مضمرات ہوتے ہیں' صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اب اُس سے' اس زندگی کو مختلف مراحل میں سے گزارتے ہوئے' گردشیں دیتے ہوئے' اس مقام تک لے آنا کہ وہ جیتا جاگتا انسان بن جائے' یہ ہے جسے خدا کی ربوبیت کا مظہر کہا جائے گا۔

نظریہ ارتقاء کے متعلق قرآنِ حکیم کی تعلیم

ہمارے دور میں Theory of Evolution (نظریہ ارتقا) کو سائنس کا معرکہ آراء کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اور یہ واقعی ہے بھی بہت بڑا کارنامہ۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ بات ہمارے اس دور میں ایجاد نہیں ہوئی۔ یوں کہہ لیجیے کہ اس کا انکشاف (Discover) ہوا ہے۔ یہ درحقیقت قرآنِ کریم میں موجود تھا۔ قرآنِ کریم کی سورۃ السجدہ میں غور کیجیے کہ کس انداز سے اس بات کو کہا گیا ہے۔ کہا کہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (32:5) اللہ تعالیٰ اپنے امر' اپنے ارادے' اپنے ڈیزائن' کی ابتدا پست ترین درجے سے شروع کرتا ہے۔ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ (32:5) پھر وہ امر آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (32:5) ایک ایک دور میں' ایک ایک مرحلے میں سے گزرتے ہوئے' جو کہ تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ وہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے (70:4) پچاس

پچاس ہزار سال کے ایک ایک مرحلے سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے آگے ہے کہ وَ الشَّھَادَۃِ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ [1] (32:6)۔

عالم الغیب اور عالم الشہادۃ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی صفت 'عزیز' اور 'رحیم' کا مفہوم

سبحان اللہ یہ ہے وہ خدا! وہاں دو الفاظ آئے: عالم الغیب اور الشھادۃ. ''غیب'' تخلیق کی وہ منزل ہے' وہ مراحل ہیں' جب وہ شے ابھی کنکریٹ (محسوس) شکل میں سامنے نہیں آتی اور ''شہادت'' اس کی اگلی منزل ہے جب وہ تخلیقی شکل کے اندر انسان کے سامنے آتی ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ چیز خدا کی دو صفات کی مظہر ہے: ایک تو ''عزیز'' ہے اور دوسری ''رحیم'' ہے۔ عزیز کے معنی ہوتا ہے جسے کسی شے کے اوپر غلبہ اور قوت حاصل ہو اور ''رحیم'' کے معنی ہوتا ہے جو نشوونما دیتا ہوا اس کو آگے لے جائے۔ یہ کہنے کے بعد پھر پہلے یہ کلیہ بیان کیا' یہ اصول بیان کیا کہ الَّذِیْۤ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (32:7) جس نے ہر شے کی نہایت متناسب اور حسین ترین انداز میں ابتدا کی۔ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (32:7) اور اسی طرح سے انسان کی تخلیق کی ابتدا ایک بے جان مادے (Inorganic Matter) سے کی۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ اس بے جان مادے (Inorganic Matter) میں' مٹی میں' پانی کی آمیزش ہوئی تو لائف (زندگی) کا پہلا جرم یا جرثومہ (Life-Cell) وجود میں آ گیا اور وہ پھر اس کے بعد مختلف منازل طے کرتا ہوا' اس عالمِ بشریت کے اندر پہنچا۔ یہ تمام Processess (عمل) جو گزارے ہیں' یہ سارا خدا کی صفتِ ربوبیت کی بنا پر ہے اور پھر ربوبیت اس انداز کی کہ یہ نہیں کہ ایک شے جس حالت میں موجود ہے وہ اسی میں موجود ہے اور اسے اسی قسم کا سامانِ نشوونما چاہیے۔ وہ کہتا ہے کہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (55:29) ہر شے مختلف مراحل میں سے گزرتی ہے اور ہر مرحلے میں اس کے لیے مختلف قسم کا سامانِ نشوونما چاہیے۔ رحمِ مادر کے اندر نشوونما کی اور کیفیت ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی۔ اس دنیا میں جب وہ پہلا ہی سانس لیتا ہے تو یہاں ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد فوراً ہی اس کو پرورش کے لیے جس غذا کی ضرورت ہوتی ہے' اس غذا کے چشمے' اس کی پیدائش کے ساتھ ہی پھوٹ نکلتے ہیں اور اس کو وہ غذا ملتی ہے اور اس انداز سے ملتی ہے کہ جوں جوں یہ بڑھتا چلا جاتا ہے' ماں کا دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر پہلے دن اس کا دودھ اتنا زیادہ گاڑھا ہو جتنا آخر میں ہوتا ہے تو بچے کا معدہ اسے ہضم نہیں کر سکتا۔ اس میں پانی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے غذائیت بڑی کم ہوتی ہے۔ جوں جوں وہ بڑھتا چلا جاتا ہے پانی کی مقدار کم ہوتی چلی جاتی ہے'

---

[1] یہ سلسلہ تخلیق وارتقا اس خدا کی طرف سے کارفرما ہے جو ہر شے کی مضمر ممکنات سے بھی واقف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے کیا کچھ مشہود ہو چکا ہے (اور کتنا کچھ ہور باقی ہے) یہ سب کچھ اس قانونِ خداوندی سے ہوتا ہے جو تمام اسکیموں کو مناسب نشوونما دے کر انہیں تکمیل تک پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے۔

غذائیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آخر میں جا کر جب وہ اناج وغیرہ کھانے کے قابل ہو جاتا ہے تو دودھ کے یہ سرچشمے سوکھ جاتے ہیں اور پھر وہ زمینی غذا کے اوپر آ جاتا ہے۔

مغرب کے سائنٹسٹ اور مردِ مومن کے نظریہ ارتقا کا تقابلی جائزہ

عزیزانِ من! مغرب کے ایک سائنٹسٹ اور مردِ مومن کے نظریہ ارتقا کے تصور میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ مغرب کے سائنسدان انسان کی موجودہ شکل کو اس Evolution (ارتقا) کی آخری کڑی مانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد جب جسمِ انسانی کی مشینری چلنے سے بند ہو جائے گی تو انسان کا خاتمہ ہو جائے گا' نظریہ ارتقا ختم ہو جائے گا لیکن قرآن کہتا ہے کہ نہیں' یہ جو تم انسان دیکھتے ہو' یہ اس کی طبعی زندگی کا ہے۔ اس کے اندر ایک شے اور بھی ہے۔ اگر اس کی نشو و نما ہوتی چلی جائے تو انسان کے جسم کی موت کے ساتھ وہ شے مر نہیں جاتی۔ ❶ زندگی یا وہ شے جسے انسان کی ذات یا Personality یا خودی یا نفسِ انسانی کہا جاتا ہے' انسان کے جسم کے مر جانے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے' آگے چلتی ہے اور اس نے آگے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے ہوتے ہیں۔ ❷ لہٰذا انسان کی موجودہ ہیئت یا اس کی زندگی کا یہ موجودہ مرحلہ تو ابھی ابتدا کی بات ہے۔

زندگی کی یہ موجودہ ہیت تو جہانِ فردا کی زندگی کا دیباچہ ہے

اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں کہ یہ دنیاوی زندگی' تو ہمارے افسانہ کا ابھی دیباچہ ہے' اصل کتاب تو اس کے بعد شروع ہونی ہے۔ اس کے لیے اقبالؒ نے بڑے ہی لطیف پیرائے میں دو شعروں میں بات کہی ہے۔ واضح رہے کہ اقبالؒ کو اللہ نے یہ خصوصی نعمت عطا کی تھی کہ وہ قرآنِ کریم کے حقائق پہ گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے بیان کرنے کے لیے اتنا حسین انداز انہیں عطا کیا تھا کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ شریعت کے بھی انتہا پہ پہنچتے تھے اور وہ شریعت محض شاعری نہیں ہوتی تھی بلکہ قرآنی حقائق کو نہایت حسین انداز میں پیش کرنے کا انداز ہوتا تھا۔ ذرا اسی چیز کو لیجیے کہ یہ جو موجودہ انسان کی ہیئت ہے' یہ اس کی مکمل ترین آخری شکل نہیں ہے بلکہ

---

❶ موت کے متعلق باردیو (bardyeau) لکھتا ہے کہ ''موت انسان کا خاتمہ نہیں کرتی' وہ صرف خارجی دنیا کے وجود کا خاتمہ کرتی ہے۔''

❷ لارڈ بلفورڈ (Lord Belford) نفسِ انسانی کی ماہیت کے متعلق کہتا ہے کہ:

An "I" must have character quite apart from the experiences, active and passive, which fill his conscious life. He must have (or be) a soul a soul, which is something more than an organized collection of capacities or a procession of physical status, a soul, which is not only merely substance but has an individuality, which is unique and indescribable (Theism and Thonghts)

خدا کے عالمِ امر یا اس کے تصور یا اس کے ڈیزائن میں جس قسم کا یہ انسان تھا' ابھی تو یہ اس میں پہلو بدل رہا ہے۔ ذرا شعر سنیے لیکن میری مشکل یہ ہے کہ اس کے زیادہ اشعار فارسی میں ہوتے ہیں اور فارسی تو ایک طرف' اب تو ہمارا دور ایسا آ گیا ہے کہ اردو زبان کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اشعار کا Translation (ترجمہ) نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال شعر تو اپنی زبان میں شعر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

یکے در معنی آدم نگر از ماچہ می پرسی

یعنی ذرا لفظ آدم کے معنوں پر غور کرو۔ مجھ سے تم کیا پوچھتے ہو؟ آدم کے ایک معنی ہوتے ہیں: گوندھی ہوئی مٹی۔ یہ وہی مٹی ہے جو کمہار کے چاک کے پاس رکھی ہوئی ہوتی ہے۔ کہا کہ ذرا اس اعتبار سے دیکھو یہ تو ابھی گوندھی ہوئی مٹی ہے۔

ہنوز اندر طبیعت می ہلد موضوع شود روزے

ابھی تو یہ خالق کائنات یا انسان کا جو خالق ہے' خدا ہے' رب ہے' یہ ابھی تو اس کے تصور میں' اس کے قلب کے اندر' پہلو بدل رہا ہے' ابھی یہ موزوں مصرعہ نہیں ہوا۔ اس میں ایک چیز اور قابلِ غور ہے۔ شاعر کے ذہن میں ایک خیال آتا ہے' ایک مضمون آتا ہے۔ وہ مضمون اس کے ذہن میں' اس کے قلب میں' اس کے دل میں جسے کہتے ہیں پہلو بدل رہا ہوتا ہے اور جب پہلو بدلنے کے بعد الفاظ کی شکل میں آتا ہے تو اسے مصرعہ موزوں کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''ہنوز اندر طبیعت می خلد''۔ یہ موجودہ پیکرِ انسانی جو ہے یہ تو خالقِ کائنات کے قلب کے اندر ابھی پہلو بدل رہا ہے۔ ''موزوں شود روزے''۔ کسی ایک دن جب یہ مصرعہ موزوں بنا تو اس کے بعد' عزیزانِ من! جو کچھ کہا ہے' وہ اقبالؒ ہی کہہ سکتا تھا۔ کہا ہے کہ ''موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے''۔ اس وقت یہ مضمون تو پیش پا افتادہ نظر آتا ہے' کچھ اہلیت ہی نہیں۔ جب یہ ذرا' ایک دن موزوں ہو گیا' تو اس کے بعد کیا ہوگا۔ کہا

کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

کہ اور تو اور خود اس کے خالق کا دل بھی اس کی تاثیر سے خون ہو کے رہ جائے گا۔ اس نے تو وہاں پہنچنا ہے صاحب!

کائنات میں ربوبیت کا یک نہ ختم ہونے والا سلسلہ

یہ ہے' عزیزانِ من! ربوبیت' یہاں تک اس نے انسان کو پہنچانا ہے: اوّلیں جرثومہ حیات سے' لائف سیل سے' لے کر پیکر بشریت تک۔ اور ارتقائے انسان کے اس مرحلے میں آ کر اس نے ایک نئی چیز دی' جسے ذاتِ انسانی کہتے ہیں۔ اس کا اضافہ کیا۔ جسم کے ختم ہو جانے پر انسانی ذات نے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا ہے۔ آگے کہاں تک بڑھتے چلے جانا ہے' ہم اس شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے قرآن نے اس کی زیادہ تفصیل نہیں دی' بات وہاں جا کے سمجھ میں آئے گی لیکن ایک مسلمان کے لیے' ایک مومن کے لیے' اس بات پر ایمان نہایت ضروری ہے کہ اس موت کے ساتھ انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا'

انسان کی زندگی آگے بھی چلتی ہے اور اس نے اگلے مراحل بھی طے کرنے ہیں۔

قرآنی الفاظ کے مفہوم اور انگریزی زبان کی اختیار کردہ اصطلاحات میں بنیادی فرق ہے

عزیزانِ من! لفظ ''رب'' کے اس مفہوم کو سامنے رکھیے اور پھر سوچیے کہ کیا اس کا ترجمہ دنیا کی کسی زبان میں بھی ہوسکتا ہے۔ انگریزی کا کوئی سا ترجمہ قرآن آپ اٹھا لیجیے۔ اس کے لیے لفظ Lord استعمال ہوا ہے۔ آپ سوچیے کہ کیا Lord کا لفظ ''رب'' کے مفہوم کو ادا کر دیتا ہے۔ مفہوم ادا کرنا تو ایک طرف رہا، معاف فرمایئے وہ تو اس سے کچھ اور الٹ جاتا ہے۔ ''رب'' تو وہ ہے جو اولیں نقطہ حیات سے حیات یعنی زندگی کو نشو ونما دیتا ہوا اوپر لیے چلے جاتا ہے اور Lord کے اندر تو بات ہی کچھ تسلط کی آ جاتی ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ تمام اصطلاحات جو انگریزی ترجمے میں استعمال ہوتی ہیں' یہ بائبل کے الفاظ ہیں' Christianity (عیسائیت) کے تصورات ہیں۔ انہی تصورات کی رو سے ہمارے ہاں ان الفاظ کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے خواہ وہ مغرب کے ترجمہ کرنے والے ہوں یا ہمارے ہاں کے کرنے والے کیونکہ زبان تو ان کے ہاں بھی وہی ہوتی ہے جو مغرب میں استعمال ہوتی ہے۔ اس لیے جب اس زبان میں ترجمہ کیا جائے گا تو Christianity (عیسائیت) کے تصورات تو آ جائیں گے۔ اللہ کے لیے God (گاڈ) کہا جائے گا تو وہ بات نہیں بنے گی۔ وہ اس کے لیے فادر (Father) کہتے ہیں۔ آپ دیکھیے کہ بات کہاں چلی گئی۔ رب کے لیے وہ Lord (لارڈ) کہتے ہیں' خدا کے لیے لارڈ کا تصور یہاں نہیں آئے گا ''رب'' کہنے سے تو بات ہی کچھ اور ہو جائے گی۔

عزیزانِ من! اسی طرح ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم کے جتنے تصورات یا Concept ہیں' جب بھی آپ انہیں انگریزی زبان میں منتقل کریں گے تو وہ پھول کی پتی کو مسل کے رکھ دیں گے۔ اس لیے یہ لارڈ نہیں ہے بلکہ یہ تو ''رب'' ہے' ربوبیت کی شان کو لیے ہوئے اور ساری کائنات اس کی شانِ ربوبیت کی مظہر ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں اس کے لیے جو نظام آیا ہے' میں نے اپنے ہاں اس کے لیے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح استعمال کی ہے اور وہ حقیقت میں یہی چیز ہے جیسے کہ آگے چل کے ہم دیکھیں گے کہ خدا کے لیے' وہ جو میں نے کہا تھا کہ اللہ کے اندر اس کا اقتدار تسلیم کرنا ہے' اشیا کے اوپر وہ اقتدار لیے ہے۔ اس نے اس لیے اپنا اقتدار رکھا ہوا ہے کہ وہ کائنات کی ہر شے کی نشو ونما کرتا ہوا چلا جائے۔ وسائلِ زندگی پر اس کا اتنا کنٹرول ہونا چاہیے کہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق ان اشیا کی نشو ونما کرتا چلا جائے گا۔ کن اشیاء کی نشو ونما؟ اس کے لیے کہا کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) اور پھر ''رب'' کے بعد یہ لفظ عالمین آیا۔

عالمین کے کیا معنی ہیں؟ یہ بھی بہت غور سے سننے کی بات ہے کہ اسی سے حمدیت کا پورا تصور ذہن میں آئے گا۔ یہ ربوبیت ہے اور ربوبیت بھی' ربوبیت عالمینی ہے۔

عالمین کا مادہ ''ع ل م'' ہے جس کے معنی ہیں: ''جاننا' پہچاننا''۔ چنانچہ عالم ل کے زیر کے ساتھ' صاحبِ علم کو کہتے ہیں یعنی ''کسی بات کا جاننے والا' پہچاننے والا'' لیکن یہ تو عربی زبان ہے۔ ل کے اوپر جب زبر آ جائے اور عالم کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں: ''وہ چیز جس کے ذریعے کسی کی پہچان ہو سکے'' یعنی کسی شے کی علامت یا نشانی جیسے علم جھنڈے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ فوج کی نشانی ہوتا ہے' علامت ہوتا ہے۔ جھنڈے سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج ہے اور یہ بھی کہ کون سی فوج ہے۔ آپ رات کے وقت کسی بیابان یا جنگل سے گزر رہے ہوں' جہاں کسی انسان کا سراغ تک نہ مل سکتا ہو' کہ اتنے میں دُور سے آپ کو ایک ٹمٹماتا ہوا دیا نظر آئے' اس سے آپ پہچان جائیں گے کہ وہاں کوئی انسان رہتا ہے۔ وہ دیا کسی انسان کی موجودگی کی ''علامت یا علم'' بن جائے گا۔

یہ کائنات انسانی زندگی کے مقامِ بلند کو متعین کرنے کا ذریعہ ہے

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی ماہیت وحقیقت انسان کے حیطہ ادراک میں نہیں آ سکتی لیکن اس کائنات کا وجود اس امر کی علامت ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ لہٰذا یہ محسوس کائنات' خدائے غیر مرئی وغیر محسوس کے پہچاننے کی علامت یا ذریعہ کہلائے گی۔ اس سے ایک بلیغ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآنِ مجید میں کائنات کو ''عالم'' کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ کائنات کا وجود مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ فقط ذریعہ ہے کسی کے پہچاننے کا' خود انسان کے مقام کے پہچاننے کا' اور اس سے آگے بڑھ کر اس امر کے جاننے پہچاننے کا' کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے' جس کی عظیم القدر اسکیم کے تابع یہ سارا نظام سرگرمِ عمل ہے۔ لہٰذا یہ محسوس کائنات مقصود بالذات نہیں بلکہ کسی بلند وبالا مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار پاتی ہے۔

مغرب کا ایک سائنٹسٹ بھی کائنات کے اوپر تحقیق وتفتیش کرتا ہے اور وہ اس کے نظام کو جانتا ہے' پہچانتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ عالم ہے اس کائنات کا لیکن وہ کائنات کو مقصودِ بالذات سمجھتا ہے' اس سے آگے نہیں۔ لیکن ایک مردِ مومن' ایک مسلمان سائنٹسٹ جب کسی کائنات کے اوپر تحقیق وتفتیش کرتا ہے اور وہ کسی نتیجے پہ پہنچتا ہے تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ جو کچھ میں نے منتخب اور محسوس کیا ہے' یہ مقصود بالذات نہیں ہے' بلکہ یہ اس سے ایک بلند اور بالا مقصد کے جاننے' پہچاننے کا ذریعہ ہے اس لیے یہ کائنات ایک مردِ مومن کے لیے مقصود بالذات نہیں ہوسکتی۔ علامہ اقبالؒ (1938-1877) نے بڑے خوبصورت انداز میں یہ بات کہی ہے کہ

مقامِ پرورشِ آہ ونالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لیے ہے' نہ آشیاں کے لیے

یہ تو فقط علامت ہے' نشانی ہے کسی بلند وبالا مقصد کے لیے۔ وہ مقصد کیا ہے' آگے چل کر سامنے آئے گا۔ یہاں لفظ عالمین آیا ہے یعنی رب العالمین' جو عالم کی جمع ہے۔ لہٰذا اس کے معنی ہوئے کائناتیں۔ ہم تو اپنی اسی دنیا کو کائنات سمجھتے ہیں لیکن نہ معلوم خدا کی پیدا کردہ

کتنی کائناتیں ہیں۔اقبالؒ (1877-1938) کے الفاظ میں:

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ وبو پر
چمن اور بھی' آشیاں اور بھی ہیں

(بال جبریل)

اس سے آگے ایک بڑا خوبصورت شعر ہے کہ

اگر کھو گیا اِک نشیمن تو کیا غم
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

(بالِ جبریل)

قرآن حکیم اور وسیع ہوتی کائناتیں

یہ تو ہوا عالمین کہ ایک کائنات نہیں' بہت سی کائناتیں ہیں لیکن یہ جو' ہم The Entire Universe ایک کائنات بھی کہیں گے تو اس Universe (کائنات) کا کوئی کنارہ نہیں ہے' یہ لامتناہی سی ہے۔ یہ عجیب چیز ہے کہ Finite (محدود) ہے لیکن اس کی کوئی حد نہیں ہے۔علم الافلاک کے ماہرین یعنی Astranomy (علم الافلاک) کے جاننے والے یہ بتاتے ہیں کہ اس کا کوئی کنارہ اور حد نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں The Expandig Universe ایک ٹرم ہے۔اس کی حد کوئی نہیں لیکن Expand ہوتی جاتی ہے۔ان کا یہ انکشاف آج کی نئی چیز نہیں ہے۔قرآن کریم نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ (35:1) اللہ تعالیٰ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اپنی مخلوق میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ کیا معلوم کتنی نئی نئی کائناتیں' نت نئے دن' وجود میں آتی رہتی ہیں۔مخلوقِ خداوندی تو اس تحیر انگیز وسعت کو پیشِ نظر رکھیے اور پھر اس حقیقت پر غور کرے کہ اس نے اپنے آپ کو رب العالمین کہا ہے یعنی تمام کائناتوں کی ربوبیت کا ذمے دار۔یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ سے تو غالب [1] کا وہ شعر یاد آ جاتا ہے کہ

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

---

[1] مرزا اسداللہ خاں غالب (1797-1869)

اس تخلیق' اس مخلوق' ان کائناتوں' میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ ان عربوں کے ہاں پھر ایک اور خصوصیت بھی تھی۔ وہ تو قوم ہی عجیب تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مٹی اور پتھر یعنی جامد چیزوں (Inorganic Matter) میں نشوونما نہیں ہوتی' اس لیے وہ ''عالم'' کا لفظ صرف جاندار یا ذی شعور چیزوں کے لیے بولتے تھے' جن کی نشوونما ان کی سمجھ میں آتی تھی۔ آج تو بہر حال سائنٹسٹ اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ جنہیں ہم جامد یا بے جان چیزیں (Inorganic Things) کہتے ہیں' درحقیقت ان میں بھی نشوونما ہوتی رہتی ہے لیکن عرب یہاں تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جو مٹی اور پتھر کی چیزیں ہیں' وہ عالم کے زمرے میں نہیں آتیں' ان کے لیے وہ عالم کا لفظ بولتے ہی نہیں تھے۔ اسی نہج سے وہ عالمین سے مراد ''دنیا کی مختلف قومیں'' لیتے تھے۔ اگر ہم عربوں کے قدیم تصور کے مطابق اس لفظ کو ''جاندار اشیاء'' تک ہی محدود سمجھیں تو بھی قرآنِ کریم کی رو سے جاندار اشیاء اسی کرۂ ارض تک محدود نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ فضائے آسمانی میں پھیلے ہوئے کرّوں میں بھی ایسے ہیں جن میں جاندار مخلوق موجود ہے۔

سموات میں بھی کروں کے اندر زندگی کا وجود

عزیزانِ من! ذرا سوچیے کہ چودہ سو سال پہلے یہ چیز خدائے خبیر و علیم کے سوا کون کہہ سکتا تھا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ وَمِنۡ اٰیٰتِہٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَثَّ فِیۡہِمَا مِنۡ دَآبَّۃٍ (42:29) آیاتِ خداوندی میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے ارض و سماء کو پیدا کیا اور ان دونوں میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ آج اس کرۂ فضائی میں تیرنے والے کرّوں کے متعلق اس نکتے پر تحقیقات ہو رہی ہیں' کہ اگر ان میں کہیں نمی نظر آ جائے' یا محسوس ہو جائے کہ ان میں نمی ہے' تو اس سے یہ نظر آ جائے گا کہ ان میں جاندار مخلوق ہے کیونکہ جان یا زندگی کا تعلق نمی یا پانی سے ہے۔ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ ارض اور سموات یہی کرۂ ارض نہیں بلکہ سموات میں بھی ایسے کرّے ہیں' جہاں تمہیں جاندار مخلوق ملے گی۔

عزیزانِ من! اب اگلا ٹکڑا' سنیے اور فرانس کے اس نامور محقق ڈاکٹر مورس بکائے ❶ کے الفاظ پہ غور کیجیے۔ وہ دنیا بھر کے سائنٹسٹوں سے کہتا ہے کہ بتاؤ چودہ سو سال پہلے یہ بات کون کہہ سکتا تھا کہ وَہُوَ عَلٰی جَمۡعِہِمۡ اِذَا یَشَآءُ قَدِیۡرٌ (42:29) جاندار مخلوق تمہارے کرۂ ارض سے ہی نہیں ہے۔ اس اجرام سماوی میں سے بھی ایسے ہیں کہ جن میں ذی حیات (چلنے پھرنے والی مخلوق) ہے اور خدا اس بات پر قادر ہے کہ جب اس کے قانونِ مشیت کا تقاضا ہو تو وہ تمہیں اور اُن کو آپس میں جمع کر دے۔ آج یہ جو چاند اور مریخ پر پہنچے کی

---

❶ Dr. Maurice Bucaille of France (1911-1989) (Ref. website Islamdawn, Shabbir Ahmed, M.D, Florida: Some Quranic vioces, Subject: No. 2: Analysis of Criticism Against Quran Upholders (Questions/ Anlswers), Sent Date: Saturday, April 01,2006. 6:03 pm) His book is the Bible, The Quran and Science.

کوششیں ہو رہی ہیں۔[1] عزیزانِ من! یہ وہی کچھ ہے، جسے قرآن نے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا لیکن اگر ہم لفظ عالمین کے مفہوم کو سمٹا کر اس دنیا کے انسانوں تک محدود کر دیں، تو اس کا مفہوم عالمگیر انسانیت یا جملہ اقوامِ عالم ہو جائے گا۔ قرآنِ کریم میں اس لفظ کو ان معانی میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً خود قرآن کو ذکر للعالمین کہا ہے اور دیگر مقامات پر اسے بصائر للناس کہا ہے، یا ہدی للناس کہا ہے۔ اسی طرح اس نے حضور نبی اکرم ﷺ کو رحمت للعالمین قرار دیا ہے اور دیگر مقامات میں حضور کی بعثت کافۃ للناس کے لیے ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے رب العالمین کے معنی ہوں گے: ''تمام نوعِ انسان کی نشو ونما کا ذمے دار''۔ میں عام طور پر اس کے لیے عالمگیر نظام ربوبیت کی اصطلاح استعمال کیا کرتا ہوں چنانچہ قرآنی معیشت پر میری کتاب کا نام ہی ''نظامِ ربوبیت ہے۔''

انسانیت کے لیے عالمگیر نظامِ ربوبیت کا ضابطہ حیات

عالمگیر انسانیت کی ربوبیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خدائے حقیقی، جس کا تصور قرآن نے دیا ہے، کسی خاص قبیلہ، خاص نسل، خاص قوم، بلکہ کسی خاص اہل مذہب کا رب نہیں، وہ عالمگیر انسانیت کا رب ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی جب خدا پر ایمان رکھنے والی امت، امت مسلمہ یا جماعت مومنین کے ہاتھوں، وہ نظام متشکل ہوگا جس کی رو سے خدا کی صفت رب العالمینی محسوس طور پر سامنے آئے گی تو اس کا عملی نتیجہ کیا ہوگا۔ یہ نظام تمام نوعِ انسان کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچانے کی ذمے داری اپنے سر لے گا۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) کرۂ ارض پر کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمے داری خدا نے اپنے اوپر نہ لے رکھی ہو۔ رزق کے خزانے تو خدا نے مہیا کر رکھے ہیں لیکن ان کی پیدائش اور تقسیم انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔ یہ امت سامانِ زیست زیادہ سے زیادہ پیدا کرے گی اور اس کے بعد اس کی تقسیم اس انداز سے کرے گی کہ کوئی انسان اس سے محروم نہ رہنے پائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے مستحق حمد وستائش ہونے کی اوّلین وجہ اس کی رب العالمینی بتائی گئی ہے۔ اسے ایک محسوس مثال کے ذریعے سمجھیے۔ ایک بچہ شاہی محل میں پیدا ہوتا ہے، ایک جھونپڑی میں بھی، غریب کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا نے دونوں کی ربوبیت کا ذمہ اپنے اوپر لیا۔ دونوں کے ہاں جو یہ بچے پیدا ہوتے ہیں، دونوں ماؤں کی چھاتیوں میں دودھ کے چشمے یکساں طور پر جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ محل کے اندر رہنے والی شہزادی، رئیس زادی، امیر آدمی کی بیوی، کے ہاں تو اس کے بچے کو دودھ ملے اور غریب کے ہاں پیدا ہونے والے بچے کو نہیں۔

---

[1] ان نکات کی تفصیل کے لیے یہ دو کتب دیکھیے: (ا) پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2005، ص ص 92 تا 110۔ (ب) پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر): مطالب القرآن فی دروس الفرقان، پارہ 29 (مکمل)، ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 2006ء، ص ص 166 اور 235۔

لفظ 'رحیم' کے مفہوم کی وسعت

خود اپنے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں کہا ہے کہ ہماری رحمت تمام اشیاء پہ محیط ہے۔ یہاں پر اگلی ہی آیت میں دو الفاظ ہیں' ان سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ وہ الفاظ ہیں: رحمٰن اور رحیم۔ ان دونوں الفاظ کا مادہ ایک ہی ہے ''ر ح م'' اور یہیں سے رحمِ مادر آپ کے ذہن میں آ جائے گا۔ رحم کے لیے بھی یہی لفظ ہے۔ بنیادی طور پر بظاہر اس کا تعلق ربوبیت سے نظر نہیں آتا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ مقامات ہیں یا ایسے ہی وہ مقام ہیں' جہاں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ عرب اپنی زبان کے اعتبار سے کتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک قوم اور وہ بھی ایسی کہ زمانہ نزولِ قرآنِ کریم میں مکہ کے اندر' جو اس پورے ملک کا مرکزی شہر تھا' بڑا ہی مشہور اور اہم مقام تھا' صرف سترہ آدمی ایسے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم تو ایک طرف رہی' وہ صرف لکھنا پڑھنا ہی جانتے تھے۔ اس قسم کی قوم نے زبان میں اس قدر وسعتوں گہرائیوں' لطافتوں اور نزاکتوں کو لیے ہوئے' تصوارت و تخیلات دیئے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ باتیں انہیں کیسے مل گئی تھیں۔ بہر حال آپ دیکھیے کہ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔

عربوں کے سامنے جب ربوبیت کا تصور آیا تو اس کو محسوس طور پر سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انہوں نے ''رحم'' کے تصور کو سامنے رکھا۔ غور فرمایئے کہ اس رحم کے ایک تصور نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ رحم مادر میں جنین کی ابتدا کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ مرد اور عورت کے جنسی اختلاط سے ایک ابتدائی لائف سیل کا استقرار رحم (Womb) میں ہوتا ہے یہ غیر مرئی جرثومہ Naked Eye (خالی آنکھ) سے نظر نہیں آتا لیکن اس جرثومے کے اندر ایک مکمل انسان بننے کی تمام ممکنات مضمر ہوتی ہیں: انسانی پیکر کی بھی اور انسانی صلاحیتوں کی بھی۔ اب اس جرثومے کو نشوونما دی جاتی ہے کہ جس سے وہ اپنے اس نقطہ آغاز سے اپنے نقطۂ تکمیل تک پہنچ جائے اور جنین ایک جیتا جاگتا بچہ' انسانی صلاحیتوں کو لیے ہوئے دنیا میں آئے۔ اب یہاں ربوبیت (نشوونما) کی جو پہلی نئی چیز ہے کہ اس میں (نشوونما) کی یہ کیفیت پیدا ہوا اس کے لیے رحم مادر کے تصور سے زیادہ کسی اور بہتر موضوع کا تصور ہو نہیں سکتا۔ اب اس کے بعد آپ دیکھیے کہ رحم کے اندر جو پرورش ہوتی ہے' اس کی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہاں جس قدر سامانِ نشوونما ملتا ہے' وہ پہلے دن سے آخری وقت تک' بچے کے بدلتے ہوئے حالات' تقاضوں اور ضروریات کے مطابق ملتا ہے یعنی ضرورت کے مطابق سامانِ نشوونما۔ پھر اگلی چیز یہ ہے کہ رحم میں اس قدر لوچ اور لچک ہوتی ہے کہ بچہ جوں جوں بڑھتا پھولتا ہے' اس کے مطابق اس خول کے اندر بھی وسعت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اتنا نرم ہوتا ہے کہ بچے کو کروٹ تک لینے میں بھی کسی قسم کی کوئی زحمت' کوئی تکلیف' کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یعنی نشوونما اس انداز سے ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور پھر اگلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب کچھ بچے کو بلا مزد و معاوضہ ملتا ہے' اس کا کوئی صلہ (معاوضہ) اسے نہیں دینا پڑتا۔ یہ اس کی بڑی خصوصیت ہے' حتیٰ کہ وہ ماں جو اپنے خونِ جگر سے اس بچے کی پرورش کرتی ہے یوں کہیے کہ وہ خود اپنے جسم کا ایک حصہ اس کی طرف منتقل کر دیتی ہے' وہ بھی اس کے سر پر کوئی احسان نہیں دھرتی۔

نشوونما کے اس پورے تصور کو ان تمام خصوصیات کے ساتھ سامنے رکھیے تو اس سے بات سمجھ میں آئے گی کہ خدا نے ربوبیت عالمینی کے بعد اپنی اس قسم کی رحمت کا ذکر کیوں کیا۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اس صفتِ رحمت کے نمود وظہور کے لیے ''رحمٰن اور رحیم'' کے دو الفاظ کیوں آئے حالانکہ دونوں کا مادہ ایک ہی ہے۔

مولانا مودودیؒ کے نزدیک 'الرحمٰن' اور 'الرحیم' کا مفہوم

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے ذکر میں کہا تھا کہ اس کا عام طور پہ ترجمہ کیا جاتا ہے: رحم کرنے والا' بہت مہربان' بہت رحم کرنے والا' بہت مہربان' اور انگریزی زبان میں اگر آپ دیکھیں تو ترجمے ہوتے ہیں: Merciful, Beneficent۔ آپ سوچیے کہ کیا مہربان' بہت مہربان' Merciful, Beneficent کے ان معانی سے کوئی خاص خصوصیت' تصور' مفہوم آپ کے ذہن میں آتا ہے؟ اگر نہیں' تو یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن اس کے لیے یہ دو الفاظ کیوں لایا ہے؟ ایک بات تو مجھے کچھ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ ہمارے اس دور کے مفسرین اس سے بھی کچھ آگے چلے گئے۔ مجھے ان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1903-1979ء) کا نام لینا پڑ گیا۔ جب میں یہ ریکارڈ کر رہا ہوں تو انہیں وفات پائے چند ہی دن گزرے ہیں تو معاذ اللہ میرا مقصد ان کی ذات کے خلاف کچھ کہنا نہیں ہے لیکن ان کی قرآنِ کریم کی تفسیر تو ان کی وفات کے بعد بھی موجود ہے اور رہے گی۔ اس لیے میں ان کی تفسیر سے ہی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب کسی بات میں زور پیدا کرنا ہو تو یونہی ایک لفظ کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً درازیٔ قد کے ذکر میں جب لمبا کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس لفظ لمبا کے بعد تڑنگا بھی کہتے ہیں تو گویا معاذ اللہ' اللہ تعالیٰ نے یہ جو ''رحمٰن ورحیم'' کے دو الفاظ استعمال کیے ہیں' اس لیے کہ یہ جو ایک لفظ کہنے سے جب تسلی نہیں ہوئی تو اس کے ساتھ یونہی ایک دوسرا لفظ کہہ دیا جیسے لمبا تڑنگا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں مثلاً یہ لمبا تڑنگا' ننگا دھڑنگا' روٹی ووٹی' تو ان میں یہ تڑنگا' دھڑنگا اور ووٹی مہمل کہلاتے ہیں۔ ان الفاظ میں زور پیدا کرنے کے لیے ان کے ساتھ مہمل الفاظ دیئے گئے ہیں۔ معاذ اللہ یہاں ''رحمٰن ورحیم'' میں ایسا نہیں ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ یہ دو الفاظ کیوں آئے ہیں؟ یہ بڑی ہی اہم بات ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے تو مغرب کے سائنٹسٹ ہی Appreciate (سراہ) کر سکیں گے۔

لغت کے لحاظ سے 'رحیم' اور 'رحمٰن' کی خصوصیات میں فرق

جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ عربی زبان کے ایک تو Root (مادے) کے اندر کچھ معانی ہوتے ہیں اور ایک اس کے ہاں مختلف ابواب ہوتے ہیں اور ہر باب میں وہی Root (مادہ) آتا ہے' اس کی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ [1] رحیم کا لفظ ''فعیل'' کے

---

[1] مادہ (Root)' اوزان افعال' مشتقاق اور ابواب کے ان نکات کی تفصیل کے لیے دیکھیے: مطالب القرآن فی دروس الفرقان سورۃ الانبیاء' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 2005' ص ص 20 تا 21 بمع انہی 2 صفحات کے فٹ نوٹ

وزن پر ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس صفت کا ظہور التزاماً بتدریج مسلسل ہوتا چلا جاتا ہے یعنی جب ہم خدا کو ''رحیم'' کہیں گے تو اس کے معنی ہیں ''اس کی صفتِ رحمت کی نمود اور اس کا ظہور مسلسل التزاماً ایک تدریج کے ساتھ ہوتا چلا جاتا ہے''۔ اس کے برعکس ''رحمٰن'' کا وزن ''فعلان'' پر ہے اور اس باب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اس صفت کا ظہور اسی شدت سے ہوتا ہے مگر اس شدت کے ساتھ وہ صفت ہنگامی طور پر، برجستہ اچانک نمودار ہوتی ہے تو گویا ''رحیم'' التزاماً بتدریج ہے اور ''رحمٰن'' میں وہی صفت رحمت، برجستہ ہنگامی طور پر، شدت کے ساتھ، اچانک نمودار ہوتی ہے۔ ان دونوں مفاہیم میں یہ فرق بڑے گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا ہے کہ مغرب کے سائنس کے محققین، اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اشیائے کائنات میں نشو و نما ارتقائی طریق سے ہو رہی ہے یعنی وہ اپنے نقطہ آغاز سے بتدریج نشو و نما پاتے ہوئے آگے بڑھتی چلی آتی ہیں تا آنکہ وہ منزل تکمیل تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہ ارتقائی مراحل کڑی در کڑی، مسلسل، تدریجاً، التزاماً طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تو یہ جو ''فعیل'' کے وزن پر ''رحیم'' کا لفظ ہے، وہ اس مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

الرحمٰن کی صفت کے سلسلہ میں مغرب کے سائنسدانوں کی ریسرچ

مغرب کے سائنسدانوں (Scientist) کی ایک تحقیق اب یہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ شے ایک ہی جست میں مختلف کڑیاں پھاند کر، ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اسے ان کی اصطلاح میں Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کہتے ہیں۔ اس کا ترجمہ ہمارے ہاں فجائی ارتقا کی اصطلاح سے ہوتا ہے۔ Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کے متعلق یہ سائنسدان کچھ نہیں بتاتے۔ چنانچہ اس نظریئے کا امام C.L. Morgan ❶ اپنی کتاب Emergent Evolution, (Edition 1923) (فجائی ارتقا) میں لکھتا ہے کہ ''اگر یہ پوچھا جائے کہ جس چیز کو تم Emergent (فجائی) کہتے ہو، وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اتنا ہے کہ یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے ❷ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں؟ تو اس کا جواب اتنا ہی ہے کہ ان کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' اسی لیے ہم اسے Emergent Evolution (فجائی ارتقا) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی باب میں Viscount Samuel نے کہا ہے کہ ''علت و معلول کی زنجیر میں بعض اوقات ایسے مستثنیات آتے ہیں جنہیں صرف دستِ قدرت ہی ظہور میں لا سکتا ہے''۔ اس کی کتاب کا نام Belief and Action ہے۔ اس میں اس نے یہ چیز کہی ہے۔ ضمناً یہ کہدوں کہ عصر حاضر کا یہ نظریہ اتفاقی نہیں ہے۔ ہمارے متقدمین حکماء کے ہاں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ابن مسکویہ، ابوعلی احمد (المتوفی 421ھ) ہمارے ہاں کا اپنے دور کا ایک سائنٹسٹ گزرا ہے۔ اس نے اپنی تصنیف ❸ ''الفوز الاصغر'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ان متقدمین کے ہاں بھی Emergent (فجائی) کی رو سے پیدا ہونے

---

❶ C.L. Morgan اپنے اس فجائی ارتقا میں Creative and Directive power of god ''خدا تعالیٰ کی قوتِ تخلیق و ہدایت'' کے لیے استعمال کرتا ہے۔

❷ نابغہ (Genius) کی نشو و نما یک طرفہ (Lop- sided) ہوتی ہے۔

❸ یہ حکیم ابن مسکویہ (المتوفی 421ھ) کا مشہور رسالہ ''الفوز الاصغر'' ہے۔ اس نے اس نظریہ پر خصوصیت سے بحث کی ہے۔ نباتات کے تدریجی ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے یہ حکیم لکھتا ہے کہ ''اب یہی تدریجی ترقی کر کے خرما کے درخت میں بغایت شرف ظہور کرتا ہے اور نباتات کو مرتبہ اعلیٰ پر پہنچاتا ہے کہ اگر اس مرتبہ سے ذرا سا بھی آگے بڑھے تو حدِ نباتاتی سے نکل جائے اور صورتِ حیوانی اختیار کر لے۔

[باقی اگلے صفحے پر]

والے خلا یا جست کو ''طفرہ'' کہا جاتا ہے۔ بہرحال کہنا یہ مقصود تھا کہ ایک تو ارتقا کا سلسلہ تدریجاً 'مسلسل' التزاماً چلا آتا ہے اور اس میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو انتظام کی کڑیاں ہیں' وہ چیخ اٹھتی ہیں اور وہ جو سلسلہ ارتقا کا ہے' وہ جست کے ساتھ پھاند کر' ہنگامی طور پر' آگے کی منزل میں' جا پہنچتا ہے۔

اب اس سے آپ دیکھیے کہ اشیائے کائنات کو ان کی نشوونما کے لیے جو سامانِ رحمت ملتا ہے' اس کی عمومی شکل تو یہی ہے کہ وہ التزاماً 'مسلسل' کڑی در کڑی ملتا جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآنِ کریم نے خدا کو ''الرحیم'' کہہ کر پکارا ہے لیکن جب اس کی نمود ہنگامی طور پر' فجائی ارتقا کی شکل میں ہو تو اس کے لیے اس نے خدا کو ''الرحمٰن'' کہا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ صرف ''اوزان یا ابواب'' کے فرق سے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اور یہ بات اس طرح سمجھ میں آ گئی کہ قرآن نے ایک ہی مادہ کے دو الفاظ کیوں استعمال کیے ہیں۔

انسانی تخلیق اور رحمانیت و رحیمیت

جہاں تک تخلیق انسانی کا تعلق ہے' قرآنِ کریم کی ایک ہی آیت میں ان دونوں صفات کی نمود بڑے بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز میں کی گئی ہے۔ سورۃ المؤمنون تیئسویں سورۃ میں یہ کہا گیا ہے کہ تخلیق انسانی کی ابتدا جامد مادہ سے ہوئی' پھر رحم مادر میں حمل قرار پایا تو نطفہ تولید نے نشوونما پانا شروع کیا۔ پہلے اس نے جونک کی سی شکل اختیار کی' پھر وہ گوشت کا لوتھڑا سا بن گیا۔ پھر اس میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ابھرا' پھر ان ہڈیوں پر گوشت کی تہہ چڑھا دی گئی (23:12-14)۔ یہاں تک طریقِ تولید و نشوونما عام حیوانوں اور انسانوں کے جنین کی صورت میں یکساں ہوتا ہے اور بتدریج عمل میں آتا ہے۔ یہ خدا کی صفت رحیمیت کی رو سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد انسان اور حیوان میں ایک ایسا بنیادی فرق پیدا ہوتا ہے' جو سابقہ کڑیوں کے ارتقا کا طبعی نتیجہ (Physical Result) نہیں ہوتا۔ وہاں یک لخت ایک تبدیلی ظہور میں آتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ (23:14) پھر خدا نے اسے ایک نئی قسم کی مخلوق بنا دیا۔ یہ التزاماً بتدریج ارتقا کا سلسلہ تھا۔ یہ فجائی ارتقا (Emerggent Evlution) کا نتیجہ تھا۔ اس خلق جدید کی رو سے انسان کو اس کی ''ذات'' عطا کر دی جاتی ہے جس کی بنیادی خصوصیت اختیار و ارادہ ہے اور جس کی نشوونما سے یہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ اس فجائی ارتقا کے لیے ''الرحمٰن'' کا لفظ آیا ہے۔ ''رحیم'' کا لفظ جو بتدریج نشوونما ہوتی تھی' اس کے لیے آیا تھا۔

[گزشتہ سے پیوستہ]

خرما کے درخت میں نفس کا اثر اس درجہ قوی اور زیادہ ہوتا ہے کہ حیوان سے کثیر مشابہت اور قوی نسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو مثل حیوان سے اس میں نر اور مادہ ہوتے ہیں اور بار آور ہونے کے لیے نر کو مادہ سے ملانا ضروری ہوتا ہے۔ اس ملانے کو تلقیح کہتے ہیں جو حیوانات کے جماع کے مثل ہے۔ پھر خرما کے درخت میں علاوہ جڑ اور رگوں کے ایک چیز مثل دماغ حیوانات کے ہوتی ہے۔ یہ اس کے لیے ایسی ضروری ہے کہ اگر اس کو کوئی آفت لاحق ہو جائے تو درختِ خرما ضائع ہو جاتا ہے۔ (حوالہ پرویزؒ: ابلیس و آدم: ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1983' ص۔14)

پیکرِ انسانی کے اندر پنہاں ذاتِ انسانی کی نشوونما کے لیے اصول واقدار

اس کے بعد آگے چلیے۔ یہیں سے انسان کے جسم کی نشوونما تو متعدد ذرائع سے' اسباب سے ہوتی ہے' کھانے پینے سے' غذا سے' ہوا سے' لیکن اس کی ذات کی نشوونما ان اقدار اور احکام کی پابندی سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی دیئے جاتے ہیں۔ جب خدا نے اپنے متعلق کہا تھا کہ کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6:54) خدا نے سامانِ نشوونما یعنی رحمت کا عطا کرنا اپنے اوپر فرض قرار دے رکھا ہے تو اس رحمت میں انسان کی طبعی زندگی کی نشوونما کے سامان کے علاوہ اس کی ذات کی نشوونما بھی شامل کی۔ یہاں ہمارے سامنے ایک اور گوشہ آتا ہے جو اس کی صفت رحمانیت کا خصوصی مظہر ہے۔ انسان کے متعلق ایک تو ظاہر ہے اور جیسا قرآنِ کریم نے بھی کہا ہے کہ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ (96:5) انسان کے اندر علم حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ علم مختلف طریقوں سے حاصل ہوتا ہے: مشاہدات' تجربات' مطالعہ' تعلیم' درس وتدریس وغیرہ۔ ان طریقوں سے علم بتدریج حاصل کیا جاتا ہے۔ بچہ ABC (اب ج) سے ایم۔ اے تک پہنچتا ہے اور جو انسان بھی چاہے علم حاصل کر سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اس گوشے میں خدا کی صفتِ رحیمیت کارفرما ہوتی ہے لیکن علم کی ایک اور قسم بھی ہے جو مندرجہ بالا طریقوں میں سے کسی طریق سے حاصل نہیں ہوسکتی' نہ ہی اس میں انسان کی اپنی کوشش یا کسب وہنر ہی داخل ہوسکتا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے اس کے برگزیدہ انسانوں کو براہِ راست ملتا تھا۔ اسے وحی کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے لیے کہا گیا کہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (2:105) اللہ اپنی مشیت کے پروگرام کے مطابق جسے چاہتا ہے' اس رحمت کے لیے مختص کر لیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حصولِ وحی میں انسان کے اپنے کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ اس حقیقت سے واضح ہے کہ جس برگزیدہ ہستی کو اس کے لیے منتخب اور مختص کیا جاتا تھا اسے وحی ملنے کے ذرا بھی پہلے اس بات کا علم واحساس تک نہیں ہوتا تھا کہ اسے یہ علم عطا ہونے والا ہے چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا کہ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ (42:52) اس سے پہلے تو جانتا ہی نہیں تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی کے عطا ہونے میں خدا کی صفت رحمانیت کا ظہور ہوتا تھا۔ اسی لیے اس کے متعلق کہہ دیا کہ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (55:1-2) قرآن کا علم رحمٰن نے عطا کیا ہے۔ یہ اس کی صفت رحیمیت کی بنا پہ بتدریج حاصل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس میں وہ چیز ہے جسے اس نے Emergent (فجائی) کہہ کر پکارا ہے' برجستہ طور پر' یک لخت کسی کو عطا ہوتا ہے اور یہاں خدا کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہوتا ہے۔

نبی اکرمؐ کے لیے قرآنِ حکیم کی تعلیم اور صفت رحمانیت

عزیزانِ من! اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے متعلق کہا ہے کہ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ

لِّلْمُؤْمِنِينَ ❶ (17:82)۔ اسے رحمت کہا گیا اور جیسا کہ ابھی میں نے کہا کہ یہ صفت رحمانیت کا تقاضا تھا جس کی بنا پہ حضور کو یہ وحی عطا ہوئی اور اب اس رحمت کے دروازے تمام مومنوں کے لیے کھول دیئے گئے' مومنین کے لیے ہی نہیں بلکہ اسے دنیا کا کوئی بھی انسان 'جو اسے حاصل کرنا چاہے' اس سے فائدہ اٹھانا چاہے' وہ اس کے لیے رحمت بن جاتا ہے اور چونکہ یہ قرآن حضور نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے ملا تھا' اس لیے حضور کو بھی رحمۃ للعالمین کہا گیا (21:107) یعنی تمام عالمین کے لیے رحمت۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ رحم کے مفہوم کے برعکس عیسائیت کے نزدیک رحم کا تصور

آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور بنیادی نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ خدا کی صفتِ رحیمیت کے اندر ''رحم'' کا مفہوم بھی شامل ہے لیکن قرآن کے' رحم کے قرآنی مفہوم اور دنیا میں رائج مفہوم میں بنیادی فرق ہے۔ اس مروّجہ مفہوم کو عیسائیت نے عام کیا اور اسی سے وہ غلط فہمیاں پیدا ہوئیں جن کا شکار خود مسلمان بھی ہو گئے۔ ان کے ہاں یہ تصور تصوف (Mysticism) کے ذریعے زیادہ پھیلا ہے۔ عیسائیت کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اوّلیں ماں باپ' آدم وحوا' کے گناہ کی آلائش میں گناہ گار پیدا ہوتا ہے۔ اسے Original Sin (اوّلین گناہ) کہا جاتا ہے۔ انسان کے لیے گناہ کی اس آلائش سے پاک اور صاف ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کا منطقی اور فکری نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی انسان جنت میں جانے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ عیسائیت میں نظریہ یہ ہے کہ جب خدا نے بیچارے انسانوں کی اس حالت پر غور کیا' تو اُسے معاذ اللہ بڑا افسوس ہوا۔ اسے ان پر ترس آیا اور اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو دنیا میں بھیجا تاکہ مخالفین اسے صلیب دے دیں اور یوں اس کا خون انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔ اس سے عیسائیت کا یہ عقیدہ عام ہوا کہ نجات کا مدار انسانی اعمال پر نہیں بلکہ خدا کے رحم پر ہے' جو اس نے اپنے بیٹے کو قربان کر کے' صلیب پر چڑھا کے' نوعِ انسانی پر کیا اور یہ رحم ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائیں' یعنی اس بات پر ایمان لائیں کہ ان کے گناہوں کے کفارہ میں انہوں نے اپنی جان دے دی۔ عہد نامہ جدید میں سینٹ پال کے خطوط پڑھیے۔ ان میں اس عقیدے کو عام کیا گیا ہے۔ ایک نے کہا ہے کہ تم کو ایمان کے نتیجے ہی سے نجات ملتی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں' خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ ایک اور خط میں اس نے لکھا ہے کہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کی رو سے نہیں بلکہ ایمان یعنی Faith کی رو سے راست باز ٹھہرتا ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کی رو سے خدا کے متعلق عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے: God is Mercy یا God is Love یعنی

---

❶ یہ سب کچھ' اس قرآن کی رو سے ہوگا جس کی تعلیم' جماعتِ مومنین کے دل کے تمام روگ مٹا دے گی۔ ان کی نفسیاتی کمزوریاں اور داخلی کشمکش دور ہو جائے گی' اور مثبت طور پر' ان کی صلاحیتوں کی نہایت عمدگی سے نشوونما ہو جائے گی۔ (مفہوم القرآن از پرویزؒ)

خدا محبت یا رحم کا مجسمہ ہے اور یہی ہے وہ تصور جس کی رو سے قرآنِ مجید کے انگریزی تراجم میں رحمٰن اور رحیم کے لیے Beneficient اور Merciful کے الفاظ آتے ہیں یعنی رحم کرنے والا' ترس کرنے والا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم کی عمارت مکافاتِ عمل کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے

عیسائیت کے اس نظریئے کے خلاف قرآنِ کریم کی تعلیم کی ساری عمارت قانونِ مکافاتِ عمل (Law of Respite or Law of Requital) کی بنیاد پر استوار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ہر انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ اس قانون کے مطابق مرتب ہوتا ہے جو خدا نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ مثلاً سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہے' صاف اور مصفا پانی ممدِ حیات ہے۔ یہی قانون طبعی کائنات میں اور خود انسان کی طبعی زندگی سے آگے بڑھ کر اس کی انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ یعنی انسان کا ہر غلط کام' ایک تخریبی نتیجہ پیدا کرتا ہے اور صحیح کام یعنی جو کام خدا کے بتائے ہوئے پروگرام اور اقدار کے مطابق ہوگا' وہ تعمیری نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اسے خدا کے نظامِ عدل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خدا کا یہ نظام غیر متبدل اور اٹل ہے اور ظاہر ہے کہ عدل میں تو رحم کا کوئی تصور ہی نہیں آ سکتا۔ اگر اس میں رحم کی بنیاد پر کچھ کیا جائے گا تو عدل کے منافی ہو جائے گا۔

عدل کے ساتھ رحم کا قرآنی تصور

لیکن ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ خدا کی صفتِ رحیمیت میں عدل کا تصور بھی شامل ہے تو اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ عدل اور رحم بظاہر دو متضاد تصورات ہیں' ان دونوں میں مطابقت کیسے پیدا ہو سکتی ہے۔ رحم کے قرآنی مفہوم کی رو سے تضاد باقی نہیں رہتا۔ اس میں عدل بھی رہتا ہے اور رحم بھی۔ اسے ایک مثال کی رو سے سمجھیے۔ ایک آدمی آگ میں انگلی ڈالتا ہے' انگلی جل جاتی ہے' اس سے شدت کی تکلیف ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ خدا کے قانونِ عدل کی رو سے ہوتا ہے' جس میں رحم کا کوئی شائبہ نہیں۔ جو شخص بھی آگ میں انگلی ڈالے گا' انگلی جلے گی تو پھر درد ہوگا' تکلیف ہوگی' لیکن جس خدا نے یہ قانون بنایا ہے کہ آگ سے انگلی جل جاتی ہے' اسی خدا نے ایسی دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں جن کے استعمال سے یہ الم انگیز تکلیف بھی ختم ہو جاتی ہے اور انگلی کی از سر نو نشو ونما کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ اس قسم کے اسبابِ مدافعت یا علاج کی تخلیق' خدا کی رحمت یا اس کا رحم ہے۔

نبی اکرمؐ کے لیے قرآنِ حکیم کی مستقل اقدار

آپ نے دیکھا کہ رحم کے اس تصور میں قانون کا تصور کارفرما ہے یعنی جس طرح خدا کا یہ قانونِ عدل ہے کہ آگ میں انگلی ڈالنے سے انگلی جل جاتی ہے' اسی طرح خدا کا یہ بھی قانون ہے کہ فلاں قسم کی دوائی لگانے سے انگلی اچھی ہو جاتی ہے۔ پہلا قانونِ عدل

بھی ہر انسان کے لیے ہے' ہر زمانے کے لیے ہے' ہر قوم کے لیے ہے' ہر ملک کے لیے ہے اور یہ دوسرا قانون جسے آپ قانونِ رحمت کہہ لیجیے یعنی اس پہلے غلط کام کی وجہ سے جو تخریبی نتیجہ مرتب ہوا ہے' اس کے ازالے کے لیے جو تجویز' تدبیر خدا نے عطا فرمائی ہے' وہ بھی تمام دنیا کے انسانوں کے لیے' ہر قوم کے لیے' ہر شخص کے لیے' ہر زمانے کے لیے' ہر ملک میں انسانوں کے لیے' یکساں طور پر آتی ہے تو جب کوئی شے جس کا اطلاق اس طرح سے ہر زمانے میں' ہر طلب پر یکساں طور پر ہو' تو اسے قانون کہا جاتا ہے۔ لہٰذا عدل بھی خدا کا قانون ہے اور اس کی رو سے انسان کے اعمال کے جو بھی نتائج مرتب ہوتے ہیں' ان کے تخریبی نتائج کے ازالے کے لیے بھی خدا کا قانون مقرر ہے۔ اس طرح اس قانون کے مقرر کرنے والے خدا کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کارفرما ہے: رحیمیت عام تدریجی طور پر اور رحمانیت جو قرآن نے اس کے لیے طریق بتایا ہے اس کی بنا پر۔ تو یہ ہے قرآن کا فلہٰذا دین کا مفہوم۔

توبہ کا قرآنی مفہوم اور یہودیوں نیز عیسائیوں کے عقائد

اب توبہ کا سوال آتا ہے۔ اگر انسانی زندگی میں اسے پیدا کر لیا گیا تو پھر توبہ کا کیا فائدہ؟ یہ ہے سوال۔ اس کا قرآنی مفہوم بھی ایک مثال سے سمجھ میں آ سکے گا۔ آپ نے کسی خاص گاؤں جانا ہے' کسی دوراہے پر آپ کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا۔ یہ گمراہی ہے 'لغزش ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا یا علاماتِ راہ سے آپ نے محسوس کیا کہ میں غلط راستے پر چل رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ اسی راستے پر آگے قدم نہیں بڑھائیں گے۔ آپ کو پھر لامحالہ اس دوراہے پر واپس آنا ہو گا' جہاں سے آپ اس غلط راستے کی طرف بھول گئے تھے۔ یہ اس صحیح دوراہے پر آنے کے لیے واپس مڑآنا جو ہے' اسے عربی زبان اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں توبہ کہا جاتا ہے لیکن محض اس دوراہے پر واپس آ جانے سے تو اس نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی جو غلط راستے پر چلنے سے ہوئی تھی۔ آپ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ آپ تو صرف اس دوراہے پر آئے۔ اب اس دوراہے سے صحیح راستے پر گامزن ہونا بھی ضروری ہے۔ اسے عمل صالح کہا جاتا ہے۔ اس طرح انسانی لغزش کے پیدا ہونے والے نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں اس طرح کی تلافی مافات اور بازآفرینی کے لیے خدا کے قوانین مقرر ہیں۔ ضابطہ حیات میں اس قسم کے قوانین کا رکھ دینا قرآنی اصطلاح میں خدا کا رحم کہلاتا ہے۔ خدا انہی معنوں میں رحیم ہے۔ ان امور کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گا جہاں توبہ سے متعلق آیات کی تشریح کی جائے گی۔

عزیزانِ من! یہودیوں کے ہاں توبہ کا تصور ہی نہیں۔ ان کے ہاں جو لغزش ہو گئی' وہ ناقابلِ تلافی ہے۔ اسی طرح عیسائیت میں بھی اعمال کے ذریعے گناہ کی آلائش کو الگ کر دینے کا امکان نہیں۔ وہ صرف مسیحؑ کے کفارے پر ہی ایمان لانے سے ہو سکتی ہے۔ ہندو دھرم کی رو سے انسان اپنے سابقہ جنم کے کرموں یعنی اعمال کے نتیجے میں جس جنم میں آ گیا' چوہا' کتا' سور' وغیرہ موجودہ جنم میں' اس کا

بدل لینا ناممکن ہے۔

بازآفرینی سے مایوسی کفر ہے

ان اہلِ مذاہب کے ہاں قرآنی مفہوم کے مطابق خدا کی رحمت یعنی بازآفرینی کے امکان سے انکار کیا جاتا ہے۔ اسے قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے اسی لیے وہ کہتا ہے کہ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (12:87) اس سے صرف وہ لوگ مایوس ہوتے ہیں جو اس کے قانون پر یقین نہیں رکھتے کہ سعی وعمل اگر صحیح خطوط پر ہوں تو ان کے نتائج بھی صحیح نکلیں گے۔ اس لیے اللہ اپنے رسول کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (39:53) اے رسول! میرے ان بندوں کو جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہوں، زندگی کے دوراہے کے غلط راستے کی طرف مڑ گئے ہوں، تو ان سے کہہ دو کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (39:53) وہ خدا کے قانونِ رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ اس کے نظامِ عدل میں غلطیوں کے نقصانات کے ازالے کا انتظام بھی موجود ہے۔ تم میں جب بھی یہ احساس پیدا ہو کہ تمہارا قدم غیر خداوندی راستے کی طرف اٹھ گیا ہے تو وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ (39:54) تم اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کی طرف رجوع کرو۔ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ (39:54) اور اس کے قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔ اس سے تم اپنی لغزش سے پیدا ہونے والے نقصانات سے بچ جاؤ گے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم اس سے پہلے کہ اس لغزش کے تخریبی نتائج تمہارے سامنے آئیں، قوانین خداوندی کی طرف رجوع کر لو۔ اگر اس میں تاخیر کر دی تو پھر ان کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا۔ اس طریق سے غلط کاموں کے تخریبی نتائج کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اسے قرآن میں چار الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا کہا کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) غلط اقدامات کے تخریبی نتائج کے ازالہ کی صورت یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ تعمیری کام سرانجام دو، برائیوں کے نتائج کو بھلائیوں سے دور کرو۔ یہ ہے خدا کے رحم کے بروئے کار آنے کی صورت۔ غلط کوشیوں سے اگر بے زار ہو گئے ہو تو خدا نے علاج کے لیے دوائیاں بھی پیدا کر دی ہیں۔ وہ علاج کرو، اس علاج سے بیماری رفع ہو جائے گی اور اس کے بعد پھر مزید تعمیری کام کرو جس سے تمہاری وہ توانائی، وہ صحت جو اس سے پہلے غلط طریق کار کی وجہ سے ضائع ہو گئی تھی، لوٹ کر آ جائے۔ یہ ہے عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا تصورِ عدل اور تصورِ رحمت۔

ہمارے نظریات، تعلیم اور زندگی پر عیسائیت کے عقائد کے اثرات

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہمارے ہاں بھی عیسائیت کے اثر سے رحم کا وہی تصور آیا جو ان لوگوں کے ہاں تھا۔ یہاں بھی یہ کہا جانے لگا کہ عدل سے کچھ نہیں بنتا، اعمال سے کچھ نہیں ہوتا، سب کچھ خدا کے فضل سے ہونا ہے، سب اس کی بخشش کے طفیل زندہ ہیں،

انسان جو جی میں آئے کرلے، کچھ نہیں بن سکتا۔ عزیزانِ من! پھر اس قسم کی چیزیں آپ نے قوالوں کے ہاں سنی ہوں گی کہ ''کی پروا اے راقب! اوتھے بے پروائیاں۔ پھڑ لے عملاں والیاں نوں، تے چھڈ دے اوگن ہارنوں'' [1] اندازہ لگایئے کہ اس طرح خدا کے نظامِ عدل اور قرآن کے تصورِ رحم میں کتنا فرق ہے اور اسے کس قدر غلط معنی پہنائے گئے ہیں۔ یہاں اجازت دیجیے کہ میں تصوف کی ایک کہانی آپ کو سناؤں۔

عدل اور فضل کے متعلق تصوف کی تعلیم

آپ کو شاید یاد ہے کہ میں نے تو اپنی آدھی عمر انہی وادیوں میں گزاری ہے۔ یہ سب چیزیں ہمیں پڑھائی جاتی تھیں۔ کہا یہ جاتا تھا کہ ایک بزرگ تھے، وہ اللہ کے مقرب بننا چاہتے تھے۔ انہوں نے بارہ برس تک ایک جنگل میں، ایک پتھر کے اوپر بیٹھ کر، خدا کی عبادت کی۔ بارہ سال کے بعد آواز آئی کہ تمہاری عبادت قبول ہوگئی ہے، مانگ کیا مانگتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ میں کیا مانگوں۔ بارہ برس کی محنت ہے۔ اُوہ خدا کہتا ہے کہ جو مانگو گے ملے گا۔ ایک بزرگ صورت سامنے تشریف لائے۔ انہوں نے کہا کہ تو کس کشمکش میں گرفتار ہے، ہم نے باتیں سن لی ہیں، جو تم سے ہوئیں، کشمکش کا ہے کی۔ بات آسان ہے، تم نے بارہ سال تک خدا کی عبادت کی، اس سے کہو کہ میں عدل مانگتا ہوں۔ اس نے کہا کہ بات ٹھیک ہے، اس کا معاوضہ تو بہت بڑا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ''میں عدل مانگتا ہوں''۔ اللہ کی طرف سے آواز آئی کہ بہت اچھا، ہم تجھے عدل دیتے ہیں، تم بارہ برس تک اس پتھر کے اوپر بیٹھے رہے ہو، اب بارہ برس یہ پتھر تمہارے سر پر بیٹھے گا۔ یہ ہے عدل۔ اسے سن کر آپ ہنسیے نہیں، عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ عدل کی کیسی Definition (تعریف) ہے!! وہ تو راضی برضا رہنے والے بزرگ تھے۔ انہوں نے اس پتھر کو اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ لیا اور بارہ برس پھر اس کے نیچے اسی طرح سے عبادت کرتے رہے۔ پھر اسی طرح بارہ برس عبادت کرنے کے بعد آواز آئی کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ پہلے عدل مانگ کے تو جو نتیجہ بھگتا تھا، وہ یاد تھا۔ کہا کہ مولا! میں تیرا فضل مانگتا ہوں، مجھے کہیں عدل نہ دے دینا، پہلے ہی میرا کچومر نکل گیا ہے۔

عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن کی تعلیم کے علی الرغم، اس تعلیم کے خلاف، کس کس قسم کے تصورات، ہمارے ہاں آئے ہوئے ہیں اور یہ اس ایک بزرگ کی کہانی پر منحصر نہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پہ آپ دیکھیں گے کہ ہر جگہ خدا کے رحم کا یہی تصور ہے، ہر جگہ اسی کی طرف سے بخشش کی التجا ہے کہ ہر چیز اس کے کرم سے ہوتی ہے، ہر کام اس کی رحمت سے ہوتا ہے، انسان اپنی محنت سے کچھ نہیں کر سکتا اس کے اعمال کوئی نتیجہ نہیں پیدا کرتے، ان کے زیرِ نظر یہ کچھ ہوتا ہے۔ قوم کے رگ و پے میں یہ چیز سرائیت کر گئی ہے حالانکہ

---

[1] اسے راقب! وہاں کوئی تصورِ عدل نہیں ہے۔ وہ ذات ''بے پرواہ'' ہے۔ وہاں تو یہ ہے کہ وہ عمل کرنے والوں کو گرفتارِ بلا کر دے اور بے عملوں کو معاف کر دے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کی رو سے خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کس قدر اٹل ہے اور اس میں جو رحم کا تصور ہے' وہ بھی ایک قانون کا تصور ہے۔ اس قانون کے اوپر عمل کرنا ہوگا تو اس سے اس غلط کام کے نتیجے میں جو نقصان ہوا ہوگا' اس کا ازالہ بھی ہو جائے گا اور مزید باز آفرینی کے نشانات بھی مرتب ہو جائیں گے۔ یہ ہے خدا کے Merciful ہونے کا تصور لیکن میں لفظ Mercy کا استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اس سے پھر وہی عیسائیت کی Mercy ہمارے سامنے آ جائے گی۔ یہ خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے اور اسے توبہ کہا جائے گا۔ توبہ کے معنی ہوں گے ''لوٹ کے' پلٹ کے' وہاں آ جانا جہاں سے قدم غلط راستے کی طرف اٹھے ہوں''۔

سابقہ دروس پر ایک طائرانہ نظر

عزیزانِ من! پہلے تو آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں جو یہ دو الفاظ آئے ہیں' ان کے متعلق دہرا لیجیے جو میں نے کہا تھا کہ ''ب'' کا معنی ہوتا ہے ''اس غرض اور مقصد کے لیے''۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن میں جب یہ چیز آئے گی تو یہ ہوگا کہ ''جو کچھ اس کے بعد کہا گیا ہے' اس کا مقصد اور اس کی غایت خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہونا ہے'' اور جب ایک مردِ مومن' ایک مسلمان' جو کوئی کام بھی شروع کرنے والا ہے' اس سے پہلے کہتا ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' تو وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ جو کچھ میں کرنے والا ہوں' اس سے میرا کوئی اپنا ذاتی مقصد نہیں' تخریبی مقصد نہیں' اس کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفت رحمانیت اور رحیمیت کا ظہور ہو جائے۔

اس کے بعد اب آ جایئے سورۃ الفاتحہ کی طرف کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o (1:1-2) سزاوارِ حمدیت' پوری کی پوری مکمل شکل کے اندر حمدیت' اس ذات کے لیے ہے جو ہر طرح کے اقتدار کا مالک ہے اور اس کا اقتدار تخریب کے لیے نہیں ہے' ربوبیت کے لیے ہے۔ اور اس کی ربوبیت کسی ایک فرد' ایک خاندان' ایک قوم' ایک ملک کے لیے نہیں' عالمین کے لیے ہے' پوری کائنات کے لیے ہے' تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں رحمانیت ہے' رحیمیت ہے' بلا مزد و معاوضہ ملتی ہے۔ جس چیز کی جس وقت ضرورت ہوتی ہے' اس انداز سے اس وقت ملتی ہے' نہایت لطافت اور رحمت اور محبت سے یہ چیز ملتی ہے اور اگر کبھی ہنگامی حالات ایسے آ جائیں کہ اس کی فوری ضرورت پڑے تو اس کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ قرآن اس کی صفتِ رحمانیت کا ظہور ہے۔ قرآن ذکر للعالمین ہے۔ خدا رب العالمین ہے۔ اس کا رسول رحمۃ للعالمین ہے۔ اور خدا نے یہ کہا ہے کہ میری رحمت تمام کائنات کو محیط ہے اور اسی کے اندر نوعِ انسان بھی آ جاتی ہے بشرطیکہ نوعِ انسانی خدا کی اس رحمت کے پروگرام کو جو قرآنِ کریم کے اندر ہے' اپنا لے۔ اب رہی یہ بات کہ خدا کا یہ قانون عدل ہے' خدا کا قانونِ مکافات ہے' جو اٹل ہے' اس کے تصور کے لیے اب ہمارے سامنے اگلے الفاظ آتے ہیں کہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ (1:3)۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسز کلثوم طلعت

علامہ اقبالؔ اور گوئٹے

مفکر پاکستان اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال ہمارے قومی و ملی شاعر اور فلسفی ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں گہرے فلسفیانہ مضامین کا احاطہ کیا اور مشرق و مغرب کے فلسفے کے مطالعے سے اپنا ایک مخصوص نظامِ فکر تشکیل دیا۔ جس میں نظریۂ خودی' نظریۂ حرکت اور کائنات کی روحانی مابعد الطبیعیاتی تعبیر پیش کی۔ اسی طرح انہوں نے مغربی نیشنلزم کے برخلاف مسلم قومیت کے تصور کو اجاگر کیا۔ علامہ اقبال نے جن مشرق و مغرب کے فلسفیوں کے نظریات کے تجزیے سے اپنے تصورات کو نیا رنگ دیا ان میں گوئٹے کا نام سرِفہرست ہے۔

علامہ اقبال' 1905ء سے 1908ء تک یورپ میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے قیام پذیر رہے۔ جرمنی میں انہوں نے پی۔ایچ۔ڈی کا امتحان پاس کیا۔ اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالہ کے زبانی امتحان کے لئے انہیں جرمن زبان سیکھنا پڑی۔ جرمن لیڈی پروفیسر ویگے ناست اور سینے شل کی مدد سے انہوں نے جرمن زبان سیکھی۔ اس طرح جرمن زبان سیکھنے کے دوران انہیں گوئٹے کی شاعری کا گہرا مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

عظیم شاعر اور مفکر کی حیثیت سے گوئٹے کی شخصیت خاص اہمیت کی حامل ہے۔ جرمن شاعر گوئٹے کی عالمِ اسلام سے دلبستگی اور مشرقی دنیا سے شغف کے سبب علامہ اقبال گوئٹے کی شخصیت کی تعریف کرتے ہیں۔

گوئٹے نے مشرقی اقدار' اسلامی روایات' اخلاقی تعلیمات اور قرآن و احادیث کے حوالوں سے اپنا مغربی دیوان لکھا۔ علامہ اقبال نے اس سے متاثر ہوتے ہوئے اور اس سے تحریک پاکر ''پیامِ مشرق'' جیسی شاہکار تصنیف تخلیق کی۔ دیباچہ ''پیامِ مشرق'' میں اقبال لکھتے ہیں:

> ''پیامِ مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن ''حکیمِ حیات گوئٹے کا مغربی دیوان ہے''۔

''پیام مشرق'' کے دیباچے میں اقبال نے جرمن ادب کی تحریکِ مشرقیت کا مختصر طور پر ذکر کیا ہے اور اس تحریک پر گوئٹے نے جو اثر ڈالا ہے اس کی طرف بھی

اشارہ کیا ہے۔

اپنی تصنیف ''پیامِ مشرق'' کی پہلی نظم میں اقبال نے گوئٹے کا ذکر جذباتی خلوص اور عقیدت مندی سے اس طرح کیا ہے: ؎

پیرِ مغرب شاعر المانوی
آں قتیل شیوہ ہای پہلوی

☆☆☆

بست نقش شاہدانِ شوخ و شنگ
داد مشرق را سلامے از فرنگ
در جوابش گفتہ ام پیغام شرق
ماہتابے ریختم برشامِ شرق۲

علامہ اقبال گوئٹے کے قدر شناس تھے۔ ماحول اور پس منظر کے اختلافات کے باوجود اقبال اور گوئٹے دونوں یک گونہ باہمی روابط کے حامل تھے۔ دونوں ادب برائے مقصد کے قائل تھے۔ جس میں انہوں نے پیغام حیات پیش کیا۔ دونوں زندگی کی عظمتوں کے ترجمان تھے۔ اقبال اور گوئٹے دونوں نے انسانی شخصیت کے ارتقاء پر زور دیا۔ اقبال نے مغرب کو مشرق سے اور گوئٹے نے مشرق کو مغرب سے ملانے کی کوشش کی۔ گوئٹے لکھتا ہے:

''جو شخص اپنے آپ کو جانتا اور دوسروں کو پہچانتا ہو وہ یہ بھی آسانی سے سمجھ سکے گا کہ مشرق اور مغرب ایک دوسرے سے قطعاً جدا نہیں ہیں۔''۳

یورپ کی ادبی تاریخ میں گوئٹے پہلا شاعر ہے جس نے مشرق اور مغرب کے باہمی تعلق کو بصیرت افروز نگاہوں سے دیکھا۔

گوئٹے' بلند فکر اور وسعتِ تخیل رکھتا تھا اور جرمن کا غیر متعصب اور امن پسند شاعر تھا۔ گوئٹے نے اسلامی تعلیمات' قرآن اور سیرتِ رسولﷺ کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ وہ قرآنی تعلیمات سے بہت متاثر ہوا۔ وہ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات کو اسلام کی روح اور قرآن کا خلاصہ سے تعبیر کرتا تھا۔ قرآن پاک سے اسے بہت عقیدت تھی۔

گوئٹے نے نظم ''نغمہ محمد'' اپنی جوانی کے زمانے میں لکھی۔ گوئٹے کی یہ نظم رسول پاکﷺ کی ذات سے محبت اور عقیدت کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس کی مثال اردو' فارسی اور عربی نعتیہ کلام میں بھی ملنا مشکل ہے علامہ اقبال نے اس نظم کا فارسی زبان میں آزاد ترجمہ کیا ہے جو ''جوئے آب'' کے عنوان سے پیام مشرق میں شامل ہے۔ بقول ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی:

''پیامِ مشرق میں اقبال کی نظم ''جوئے آب'' گوئٹے کی نظم "Muhmets gsang" کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں جو "West desttícher Divan" (دیوان عربی) سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی۔ عظیم جرمن شاعر نے

اسلامی تصورِ حیات کی ایک حسین تصویر پیش کی ہے......۔

......گوئٹے نے حضرت محمد ﷺ کا تصور ایک فراخدل اور ہمہ گیر شخصیت کے روپ میں پیش کیا ہے۔'' ۴

اقبال نے گوئٹے کی نظم "Muhmets gsang" کا فارسی زبان میں ''جوئے آب'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس نظم (جوئے آب) کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

واکردہ سینہ رابہ ہوا ہائے شرق و غرب
درِ برگرفتہ ہم سفرانِ زبوں و زار
زی بحر بیکرانہ چہ مستانہ می رود
باصد ہزار گوہر یک دانہ می رود ۵

ترجمہ: (''پورب اور پچھم کی ہوائیں سینہ کشادہ کئے ہوئے گرے پڑے ہم سفروں کو آغوش میں لئے ہوئے بے کنار سمندر کی طرف مستانہ چلی جارہی ہیں' ہزاروں بے مثال موتی لئے ہوئے رواں دواں ہیں)''۔

گوئٹے نے نظم نغمۂ محمد ﷺ'' میں آپ ؐ کی سیرت کے حوالے سے ذاتِ مبارکہ کی شخصی خوبیوں کا ذکر کیا ہے اور انسانی خدمت کا جذبہ' نوع انسانی کی فلاح و بہبود کی فکر' مثالی معاشرے کی تعمیر کی لگن اور دعوت وتبلیغ کا ذکر اس نے اپنی اس نظم میں کیا ہے۔ گوئٹے کا ''مغربی دیوان'' جو اس کے آخری ایام حیات کی یادگار ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن اور اسلامی تعلیمات سے بہت متاثر ہوا۔ قرآنی آیت ''للہ المشرق والمغرب'' کا ترجمہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

''مشرق بھی خدا کا گھر ہے اور مغرب بھی'' ۶

گوئٹے نے اللہ تعالیٰ اور اشرف المخلوقات انسان کے تعلق کا اسلامی نقطۂ نگاہ سے تجزیہ کیا اور اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ اسلامی تعلیمات کی بنیاد مخلوق کی طرف سے خالقِ حقیقی خدا تعالیٰ کی مکمل اور غیر مشروط اطاعت پر ہے چنانچہ مغربی دیوان میں گوئٹے کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے:

''اگر اسلام کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے مطابق ڈھال کر اس کے تابع کرلیں تو ہم یقیناً اسلام ہی میں جیتے اور اسلام ہی میں مرتے ہیں۔'' ۷

گوئٹے سورۃ فاتحہ کی آیت ''اھدنا الصراط المستقیم'' ۸ (سے متاثر ہوتے ہوئے) اپنے لیئے اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا گو ہوتا ہے۔

''خداوند! جب میں کسی کام میں ہاتھ ڈالوں یا جب میں شعر کہوں تو سیدھے راستے کی طرف میری راہنمائی کر......۔'' ۹

علامہ اقبال گوئٹے کے اس اسلامی نقطۂ نظر اور عظیم خیالات کے باعث فرماتے ہیں۔ کہ گوئٹے کے مطالعے کے بعد انہیں اس کے خیالات کی بلندی اور وسعت

کا اندازہ ہوتا ہے۔

علامہ اقبال، گوئٹے کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

''جب کسی عظیم ذہن سے ہمارا رابطہ قائم ہوتا ہے تو ہماری روح اپنا انکشاف کر لیتی ہے۔ گوئٹے کے تخیل کی بے کرانی سے آشنا ہونے کے بعد مجھ پر اپنے تخیل کی تنگ دامنی منکشف ہوگئی۔''[10]

علامہ اقبال کے مطابق جب ہم کسی عظیم شخصیت یا اعلیٰ ذہنی وتخلیقی صلاحیت کے حامل انسان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے اندرونی خیالات کی تشکیل ہوتی ہے اور ہماری روح اس سے ہم آہنگی محسوس کرتے ہوئے ویسے ہی تخلیقی عناصر اپنے اندر محسوس کرتی ہے گویا کسی بڑی شخصیت کا کارنامہ ہماری تخلیقی و ذہنی استعداد کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے اور ہماری روح اور ذہن کا تزکیہ ہو جاتا ہے۔ گوئٹے جیسے عظیم جرمن شاعر کا مطالعہ کرتے ہوئے علامہ اقبال یہ محسوس کرتے ہیں گویا ان کی فکر کی روح اس میں بھی موجود ہے، اس طرح ان کی تخلیقی و ذہنی استعداد متاثر ہوتی ہے اور ویسے ہی خیالات کی تحریک اپنے اندر پاتی ہے۔ علامہ اقبال کو گوئٹے کے خیالات کی وسعت اور فکر کی گہرائی کے سامنے اپنی فکر اور تخیل محدود نظر آتا ہے۔

گوئٹے عالمی شہریت رکھتا تھا۔ اس کی شخصیت کسی جغرافیائی یا سیاسی حدود کی پابند نہیں تھی۔ اس کی تفریحی سیاحت اگرچہ صرف جرمنی، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ تک محدود رہی لیکن وقت اور مقام کی حدود و قیود کی اس نے کبھی پروا نہیں کی اس کے ذہن کی حیرت انگیز آفاقیت نیز اس کی فراخدلی اور وسیع النظری سے اقبال بہت متاثر ہوئے اور اسے عظیم اور اعلیٰ وارفع شخصیت کا درجہ دیا۔

اقبال نے گوئٹے کی تصانیف کو بہت اہمیت کا حامل قرار دیا کیونکہ گوئٹے کو مشرق اور اسلام سے جو ذہنی اور روحانی شغف تھا۔ اس کی تصانیف میں بھی اس کا رنگ جھلکتا ہے۔ گوئٹے کی تصانیف میں 'فاؤسٹ' ورتھر' ولہلیم مائسٹر اور مغربی دیوان کافی مقبول ہوئیں۔ ان کے تراجم بنگالی، انگریزی، سندھی اور اردو زبانوں میں کئے گئے۔ جس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

جرمنی کا شاعر گوئٹے مشرق اور مغرب کو قطعاً جدا نہیں سمجھتا وہ 'مغربی دیوان' کی پہلی نظم 'ہجرت' کے پہلے بند میں کہتا ہے:

''شمال، جنوب اور مغرب ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں، تخت و تاج پاش پاش ہونے کو ہیں، سلطنتیں لرز رہی ہیں۔ آؤ ہم مشرق کی پاک فضاؤں کی طرف چلیں اور پیرانِ مشرق کی صحبت سے فیض یاب ہوں۔''[11]

مغرب میں انسانی ہمدردی کی گرم جوشی اور روحانیت مفقود تھی۔ مغرب سے مایوسی اور بے زاری کے

نتیجے میں گوئٹے کے دل میں مشرق سے دلی عقیدت پیدا ہو گئی۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی رقم طراز ہیں:

''گوئٹے کے ذہن و مزاج کی ثقافتی بنیاد اقبالؔ کے مقابلے میں وسیع تر تھی۔ وہ مغرب اور مشرق کی کئی زبانیں جانتا تھا، خصوصاً عربی و فارسی زبان و ادب کے بارے میں اس کی دلچسپی حیرت انگیز تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنی مشرقی مدمقابل شخصیت (اقبال) سے کہیں زیادہ، تاریخ و ثقافت کے بند خزانوں کو کھولا ہے۔''[۱۲]

گوئٹے اور اقبال دونوں بیرسٹر تھے۔ گوئٹے کو قانون سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ دونوں کو زندگی سے گہری وابستگی تھی، انہوں نے اپنی زندگی کی توانائیاں اور قوتیں بلند مقاصد کے حصول کے لئے صرف کر دیں۔ علامہ اقبال کو انسانی شخصیت کے ارتقاء سے گہری دلچسپی تھی۔ جس کے سبب وہ گوئٹے کی طرف مائل ہوگئے۔ اس کے علاوہ مشرق اور مشرقی ادبیات سے گوئٹے کی دلچسپی اور اسلام سے گوئٹے کی عقیدت بھی اقبال کے لئے کشش کا باعث بن گئی۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''حافظ کی شاعری نے گوئٹے کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا بلکہ اس نے (گوئٹے) اس کے مغربی دیوان کے لئے محرک کا کام دیا۔''[۱۳]

اقبال ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''گوئٹے اپنے تخیلات میں حافظؔ، شیخ عطارؔ، سعدیؔ، فردوسیؔ اور عام اسلامی لٹریچر کا بھی ممنون احسان ہے۔''[۱۴]

اقبال اور گوئٹے میں بہت سی خصوصیات مشترک نظر آتی ہیں دونوں زندگی کو آفاقی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور مظاہر کائنات سے گزر کر حقیقت کا ادراک کرتے ہیں۔ اقبال کی شخصیت میں مغرب اور مشرق کا امتزاج ملتا ہے۔ جس کے حوالے سے دو بڑے اہم ارتقائی اثرات ہیں ایک مشرقی یعنی رومی کی شخصیت کا اثر دوسرا مغربی یعنی گوئٹے (اور کچھ دیگر مغربی مفکرین کا) اقبال نے دونوں کے متعلق کہا ہے:

''نیست پیغبر ولی دارد کتاب''

(وہ پیغبر نہیں لیکن کتاب رکھتا ہے)[۱۵]

کتاب کا اشارہ ''مثنوی مولانا روم'' اور فاؤسٹ کی طرف ہے اقبال فکری طور پر رومی اور گوئٹے سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ 'پیامِ مشرق' میں ''جلال و گوئٹے'' کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں علامہ اقبال نے دونوں کی روحانی عظمت اور حقیقت پسندی کا اعتراف کیا ہے اور نظم کے آخری حاشیے میں گوئٹے کے ڈراما فاؤسٹ کے متعلق مندرجہ ذیل تعریفی نوٹ لکھا ہے:

''......گوئٹے کا ڈراما ''فاؤسٹ'' مشہور اور معروف ہے اس ڈرامے میں شاعر نے حکیم ''فاؤسٹ'' اور شیطان کے عہد و پیمان کی قدیم روایت کے پیرائے میں انسان کے امکانی نشوونما کے تمام مدارج اس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آ سکتا۔''[۱۶]

خطبات میں کئی مرتبہ گوئٹے کا ذکر ملتا ہے ایک جگہ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

''قرآن کا سب سے بڑا مقصد انسان کے دل میں ان ازلی روابط کا احساس پیدا کرنا ہے جن کے ذریعے اس کا رشتہ خدا اور کائنات سے استوار ہوتا ہے۔''[۱۷]

علامہ اقبال کے کلام کے سبب ہم نہ صرف گوئٹے سے روشناس ہوئے بلکہ پاکستان اور جرمنی کے درمیان سب سے بڑا ثقافتی رابطہ اقبال اور ان کا کلام ہے۔

گوئٹے جیسا مغرب کا شاعر قرآن' سیرت محمدیﷺ اور اسلامی تعلیمات سے متاثر ہے اور قرآن کے عملی پہلوؤں پر زور دیتا ہے اور رسول پاک سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے مشرقی اقدار کو مغربی ناآسودگی پر ترجیح دیتا ہے۔ آج ہم مسلمان ہوتے ہوئے مغربی تہذیب وتمدن کو روشن خیالی کے زعم میں مشرقی اسلامی اقدار پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم قرآنی تعلیمات پر صدقِ دل سے عمل کریں اور اسلامی مشرقی اقدار اپناتے ہوئے اپنا اسلامی تشخص برقرار رکھیں۔

حواشی:

۱۔ اقبال ڈاکٹر محمد' دیباچہ پیامِ مشرق کلیات اقبال فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور' بارِاول ۱۹۷۳ء' کلیات صفحہ ۲۴۱ ایضاً صفحہ ۷۔

۲۔ اقبال ڈاکٹر محمد' (پیام مشرق) تسہیل پیام مشرق (تسہیل از احمد جاوید) اقبال اکادمی پاکستان لاہور' بار اول ۱۹۹۲ء ص ۳۹۷۔

۳۔ جاوید یونس (مرتب) صحیفہ اقبال بزم اقبال کلب روڈ لاہور' بار اول ۱۹۸۷ء' ص ۶۲۔

۴۔ صدیقی' افتخار احمد ڈاکٹر' فروغِ اقبال' اقبال اکادمی پاکستان' لاہور' ۱۹۹۴ء' ص ۱۶۰۔۱۶۱۔

۵۔ اقبال ڈاکٹر محمد' پیامِ مشرق' (تسہیل کلامِ اقبال' ایضاً ص ۳۹۷۔

۶۔ جاوید یونس (مرتب) صحیفہ اقبال' اقبال اکیڈمی پاکستان لاہور' بار اول ۱۹۹۲ء' ص ۶۳۔

۷۔ صحیفہ اقبال' ایضاً ص ۶۴۔

۸۔ قرآن پاک' سورح فاتحہ آیت ۵۔

۹۔ صحیفہ اقبال' ایضاً ص ۶۴۔

۱۰۔ اقبال ڈاکٹر محمد' شذرات فکرِ اقبال' ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (مترجم) مجلس ترقی ادب' ۲ کلب روڈ' لاہور' بار دوم ۱۹۸۳ء' ص ۶۵۔

۱۱۔ صحیفہ اقبال' ایضاً ص ۶۲۔

۱۲۔ صدیقی' افتخار احمد ڈاکٹر' فروغِ اقبال' ایضاً ص ۱۵۔

۱۳۔ چشتی' یوسف سلیم' پروفیسر۔ شرح پیام مشرق۔ عشرت پبلشنگ ہاؤس' اردو بازار لاہور' ص ۷' سن ندارد۔

۱۴۔ اقبال ڈاکٹر محمد' دیباچہ پیامِ مشرق' مقالاتِ اقبال' سید عبدالواحد معینی' آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور' ۱۹۸۸ء ص ۲۴۴۔

۱۵۔ اقبال ڈاکٹر محمد' (پیام مشرق) کلیاتِ اقبال (فارسی) شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور' بار اول ۱۹۷۳ء کلیات ۳۷۶۔

۱۶۔ ایضاً' پیامِ مشرق' صفحہ ۲۰۶ کلیاتِ اقبال' صفحہ ۳۷۷۔

۱۷۔ اقبال ڈاکٹر محمد' تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' سید نذیر نیازی (مترجم) بزمِ اقبال نرسنگھ داس گارڈ' لاہور ۱۹۵۸ء' ص ۶۶۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

کیا اس زمین پر یہی آسمان ہے؟

گوتم بدھ نے دنیا کو دکھوں کا گھر قرار دے کر اس غم بلکہ اس غصے میں دنیا ''چھوڑ'' دی تھی۔ برٹرینڈ رسل جن کے ساتھ ہمارا رشتہ Love Hate Relationship والا ہے کہ ان کے افکار ہمیں بے طرح اپنی اور کھینچتے بھی ہیں اور ہم ان سے سخت اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ انسان کی نفسیات بھی بڑی پیچیدہ چیز ہے کہ کبھی کبھی وہ بیک وقت کسی کا خوشہ چیں اور نکتہ چیں بن جاتا ہے۔ ایسا کیوں اور کب ہوتا ہے؟ اس نازک موضوع پر پھر کبھی گفتگو ہو گی۔ سرِ دست رسل کے اس فرمان کو گوتم بدھ کی درجاتی تائید میں Quote کرتے ہیں۔

''دنیا اوٹ پٹانگ سی جگہ ہے۔ اس میں خوشگوار باتیں اور ناخوشگوار باتیں بڑی بے ہنگم ترتیب میں واقع ہوتی ہیں۔ اس بے ہنگم دنیا سے ایک قابل فہم نظام یا خاکہ ترتیب دینے کی خواہش کسی گہرے خوف کا نتیجہ ہوتی ہے جو ایک قسم کی وسیع خلاؤں کا خوف ہے۔''

دنیا کے دکھوں سے گھبرائے ہوئے ایسے ہی افسردہ کردار کے متعلق رسل کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ بالآخر کسی نظامِ فلسفہ یا کسی مسلک میں غیر حقیقی تسکین تلاش کرنے لگتا ہے۔

صاحبو! یہ بڑے لوگ یونہی بڑے تسلیم نہیں کر لئے گئے۔ ان کی عظمت کا راز ان کے فکر ونظر کی حیران کن گہرائیوں سے وابستہ ہے۔ کوئی ایسی Dynamic بات' کوئی ایسا قوت آفریں خیال بھی ہوسکتا ہے جو آن واحد میں فرد کے تصورات کو دھماکے سے اڑا کر رکھ دے۔ آپ غور کیجئے رسل بدھا کو Wet کر رہے ہیں۔ یہ دنیا عذابوں کا مسکن' اذیتوں کا مرکز تبھی ثابت ہو گی اگر اسے بے ہنگم' لایعنی' عبث' بے کار اور Vague تسلیم کر لیا جائے۔ ویسے برٹرینڈ رسل اس فرقے کے بانی نہیں ہیں۔ دنیا کو Absurd یعنی بے سروپا کہنے والے زمانہ قدیم سے چلے

آ رہے ہیں۔ جدید دور کا طغرائے امتیاز بس یہ ہے کہ اس نے پرانے عقائد کو جدید اصطلاحات کا باوقار پیرہن عطا کر دیا ہے۔ انگریزی داں طبقہ جسے Elench یا Refutation کہتا ہے۔ ہم اپنی آسانی کے لئے اسے مغالطہ دینے والی دلیل' عنوان دے لیتے ہیں۔ دراصل یہی وہ سحر ہے جس کا توڑ بڑا مشکل ہے۔ یہ کوئی دو پہلوانوں کا دنگل نہیں ہے جس میں گوشت کے پہاڑ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ جیتنے والے کے گلے میں کرنسی نوٹوں کے ہار پڑتے ہیں اور ہارنے والے کو ''اوئے اوئے'' کے نعرے سننے پڑتے ہیں۔ یہ تو میاں! دو بڑے ذہنوں کی جنگ ہے۔ اس سے جڑی فتح وشکست صدیوں تک کے لئے قوموں کے طرزِ احساس اور اسلوبِ عمل کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

دنیا کو لغو کہنے والے سب سے پہلے دکھ ہی شمار کرائیں گے۔ عذابوں کے ہجوم کا منظر ہی سامنے لائیں گے۔ اب ہمارا عام جذباتی' ردِّعمل میں کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہ خطیبانہ جوش کے ساتھ کسی خاص فکر وفلسفہ کا پرچار شروع کر دے گا۔ ایسے فکر وفلسفہ کا جس میں منطق اور معروضیت کا نام ونشان بھی نہیں ہوگا بلکہ ہزاروں برس پیچھے کو زقندیں ہوں گی یا پھر کسی ان دیکھے' مبہم اور مگھم مستقبل کے نظارے ہوں گے۔ چند ڈراوے ہوں گے چند پیش گوئیاں ہوں گی اور بہت بڑی چھلانگ لگالیں گے تو اس Dogma سے اپنی گہری جڑت کو بطور برہان کے پیش کر دیں گے اور آگے جائیں گے تو اپنی قلبی تسکین کو اپنے تئیں ناقابل تردید شہادت کا رنگ دے دیں گے۔ اس ساری کارروائی کے جواب میں رسلین کتنی آسودگی سے اس قول کو دہرا دیں گے کہ یہ سب اپنی افسردگی کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ مسالک کی خانقاہوں اور شخصیات کی پناہ گاہوں میں خود کو گم کر کے غیر حقیقی تسکین کا حصول محض ایک Addiction ہے کہ جو لایعنیت موجود ہے وہ تو بدستور سر پر کھڑی دندنا رہی ہے۔ موت کو زندگی' بیماری کو صحت' ماتم کی صدا کو شہنائی کی آواز' الیے کو طربیہ' بے ترتیبی کو ترتیب' غربت کو امارت' ذلت کو عزت' تحقیر کو توقیر' بے قرار کو قراری' بدبو کو خوشبو' اسیری کو رہائی' غلاظت کو نعمت' دکھ کو سکھ ثابت کر کے دکھایئے؟ نیز وہ اس پر بھی اصرار کریں گے کہ حضرت! یہاں Subjectivity سے کام نہیں چلے گا۔ معیارِ صداقت Objectivity ہے۔ اب ہم کیا کریں گے؟

دوستو! یہ وہ مسئلہ ہے جسے اپنے اساسی مضمون کے طور پر قرآن مجید نے لیا ہے۔ افسوس کہ ہمارے روایتی اس پر بہت کم بات کرتے ہیں۔ پڑھی لکھی نسل کی ذہنی علمی بے چینیوں کا مداوا ان کے پاس قطعاً نہیں ہے۔ بس مانی ہوئی باتوں کو منوانے کی مساعی میں یہ خوش فہم مگن ہیں۔

قرآن کا عجیب اعجاز ہے کہ اس کا ہر دعویٰ دلیل سے مزین ہے اور اسی مقام پر۔ مثلاً: ''اربابِ عقل و بصیرت' سلسلۂ کائنات پر پورے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ خدا نے اس سلسلہ کو باطل (بے مقصد' بیکار تخریبی نتائج پیدا کرنے کے لئے) نہیں پیدا کیا۔'' (3/190)۔ ''یہ تصور کہ کائنات بے مقصد پیدا کی گئی ہے انسانیت کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔'' (3/190)۔

یہاں ہم ایک بنیادی نکتہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر تو یہ کائنات بے معنی ہے تو یقیناً اس کا کوئی خالق نہیں ہے اور اگر اس کا کوئی حکیم خالق ہے تو پھر اسے بے ہنگم اور اوٹ پٹانگ قرار دینا ناممکن ہے۔ رسل بہت عالی دماغ ریاضی دان تھے۔ ہم ان کی ''روح'' سے پوچھتے ہیں کیا اس پوری کائنات میں کوئی ایک جہت ایسی ہے جو ریاضیاتی ربط سے عاری ہو؟ چلئے دنیا کے کسی اور باقاعدہ ریاضی دان سے استفسار کر کے دیکھ لیجئے جو یہ کہہ دے کہ یہ عظیم الشان کاسموس تنظیم اور آہنگ سے محروم ہے۔ اگر کہیں سے تائید نہ ملے تو پھر اسے ''اوٹ پٹانگ'' کہنا ایک فلسفی کو زیب دیتا ہے نہ علم ریاضی کے ماہر کو۔ ہم یہاں رسل مرحوم کو رعایتی نمبر دے دیتے ہیں کہ ممکن ہے اس کے نکتے کا تناظر معاشرتی زندگی ہو۔ تو ہم مانتے ہیں کہ بیرونی کائنات کے سلسلے میں جو ترتیب رب کریم نے لگائی ہے۔ وہ نہ تو اس نے کسی سے مشورہ کر کے لگائی ہے اور نہ تمام مخلوقات مل کر اس میں کوئی تغیر برپا کر سکتی ہیں۔ رہی سائنس کی فتوحات تو کسی بنیادی قاعدے کلیے میں وہ ترمیم سے تعبیر نہیں ہو سکتیں۔ مسئلہ صرف انسان کی سماجی حیات کا ہے اور یہ بڑی سادہ سی بات ہے کہ خود خدا نے حضرتِ انسان کو بعض اختیارات تفویض فرمائے ہیں۔ بس ساری ''بے ترتیبی'' اسی کا شاخسانہ ہے۔ یوں نیچرلی جو ''مسائلستان'' جنم لیتا ہے اس پر جلدی سے ہمارے کمزور اعصاب فلسفی پریشان ہو کر ''اوٹ پٹانگ'' کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ برطانیہ میں ٹریفک کا جو سسٹم ہے کیا وہ وہی ہے جو ہمارے مصری شاہ میں عملاً رائج ہے؟ اس بے ترتیبی کا ذمہ دار کون ہے؟ بلاشبہ یہ ہمارا المیہ ہے۔ اب اس کی اساس پر کیا ہم یہ کہتے ہوئے کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے جنگلوں کو بھاگ جائیں؟

ہاں اگر خدا چاہتا تو وہ ہر انسان کو ایسا روبوٹ بھی بنا سکتا تھا جس کا رخ ہر لحہ خیر ہی کی جانب رہتا۔ پھر واقعتاً اس دنیا میں کوئی دکھ نہ ہوتا بلکہ دکھ اور سُکھ کا شعور ہی نہ ہوتا۔ تب بدھا اور رسل کو کامل آسودگی مل سکتی تھی۔ لیکن تب یہ المیہ ضرور جنم لیتا کہ دنیا کے تمام انسان بدھا اور رسل ہوتے۔ تو نتیجہ ساری گفتگو سے یہ نکلا کہ جب یہ کہا گیا ہے کہ یہاں بے مقصد کچھ بھی پیدا نہیں کیا گیا ہے تو دکھ بھی بے مقصد پیدا نہیں کئے گئے۔ اب ان دکھوں کو سُکھوں میں

بدلنے بلکہ سُکھوں کو دکھوں میں بدلنے کا اختیار انسان کو دے دیا گیا ہے اور ساتھ وہ قوانین اضافی نہیں ہیں۔ حتمی، قطعی مستقل بلکہ مطلق ہیں۔ اس پس منظر میں ہی کشمکش کا وہ انگارہ رقص کرتا ہوا ابھرتا ہے جسے زندگی/ حیات کہا جاتا ہے۔ سچ مچ کی زندگی۔ بے جان زندگی نہیں۔ بے مقصد زندگی نہیں اور بے مقصدیت کی تو تعریف ہی یہ کی گئی ہے وہ شے جو قیاسی ہو اور تعمیری نتائج ترتیب دینے سے عاری ہو۔ باقی نہ رہنے والی ہو۔ علم وعقل، عدل وانصاف اور تجربہ و مشاہدہ اس کے مصدق نہ ہوں۔۔۔ کیا یہ سوچ غیر حقیقی تسکین کے حصول کے لئے محض مسلک کی حیثیت رکھتی ہے یا خود مغرب کے قانون پسند اور ترتیب آشنا معاشرے اس کے عملی موید بھی ہیں۔ اگر یہ زندگی اوٹ پٹانگ ہی ہوتی تو خود رسل بھی کسی مربوط فلسفے کی تخلیق کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔

(بحوالہ: روزنامہ دن لاہور، 29 جون 2007ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر انعام الحق

حکمت کی باتیں

(۱) صرف اچھے معاشرے ہی میں بلند کردار افراد نشو ونما پاسکتے ہیں۔ (افلاطون)

(۲) مجھ پہ الزام لگانے والوں نے ایک لفظ بھی سچ نہیں کہا' لیکن آپ مجھ سے مکمل سچ سماعت کریں گے۔ (سقراط)

(۳) خاموش رہنا (یعنی تبلیغ سے اجتناب کرنا) حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہوگی۔

(۴) ھیگل نے حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات قلمبند کی۔ اس تالیف میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ مریم اور یوسف کے لڑکے تھے اور بعد میں کتاب کو ضائع کر دیا۔ (ماخوذ داستان فلسفہ تالیف وِل ڈیورینٹ (مترجم سید عابد علی عابد' ص ۳۷۰)۔

(۵) صداقت ہمیں دولت مند تو نہیں بنائے گی' لیکن ہمیں آزادی ضرور عطا کرے گی۔

(۶) مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہو' تو اپنی اصطلاحات کی تعریف کرو۔ یہی منطق کی ابتدا اور انتہا ہے۔ (والٹیر)

(۷) بچپن میں انسان کی روح اور جانوروں کی روح میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ (ارسطو)

(۸) جس کے بہت دوست ہوں' اس کا دوست کوئی بھی نہیں۔ (ارسطو)

(۹) چکبست کے شعر کی ترمیم۔

فلسفہ کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
سائنس کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

(۱۰) علت اور معلول۔ قانون اور قاعدے ہی کا دوسرا نام ہے۔

(۱۱) جس طرح دانہ زیر زمین جا کر دوبارا اگ آتا ہے' اس طرح انسان میں دفن ہونے کے بعد ایک اور دنیا میں اٹھ کھڑا ہوگا۔ (اینسی اسرار)

(۱۲) جو شخص اپنی زندگی کا جائزہ نہیں لیتا اور اپنے نفس کا احتساب نہیں کرتا وہ زندہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ (سقراط)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆